U 13763

27.11.09

Title — Al Khitab

Creator — Mohd. Suleman Ashraf

Publisher — Institute Press (Aligarh)

Date — 1915

Pages — 40

Subjects — Khutbaat-O-Taqareer.

سید محمد احسن

آتیناہ الحکمۃ و فصل

۲۱ احسن

الخطاب



تقریر فقیر محمد سلیمان اشرف

بموقع اجلاس بست و ہشتم کانفرنس

منعقدہ راولپنڈی



باہتمام محمد مقتدیٰ خان شروانی

مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ

۱۹۱۵ء

فہرست مضامین



بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً ومصلیاً

خطبۂ مسنونہ وصلوٰۃ تنجینا وتعوذ وتسمیہ کے بعد یہ آیت کریمہ تلاوت کی گئی۔ ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝

بشارتِ فتح مبین

یہ آیۂ کریمہ آخر رکوع سورۂ فتح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کی ایک جماعت ہے جو حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں سعادتِ کونین کی دولت لوٹتی ہوئی مدینہ طیبہ واپس جارہی ہے۔ بغرض عمرہ رسول کریم علیہ الوف الصلوٰۃ والتسلیم چودہ سو مسلمانوں کو لیکر عازم مکہ معظمہ ہوئے تھے۔ کفار مزاحم ہوئے اور حدیبیہ سے آگے بڑھنا نہوا۔ یوں تو واقعہ طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ ایک صلح نامہ لکھا گیا جس کے شرائط مسلمانوں پر شاق تھے۔ لیکن سرکار دوعالم کی متابعت اسی میں تھی لہذا بسر وچشم منظور تھا۔ مگر اس طرح کی مراجعت نے دلوں کی اُس کیفیت کو جس میں ایک سوزش اُس سوزش میں اخلاص اُس اخلاص میں عبودیت کاملہ موجود تھی ذرا چمکا دیا تھا۔ اس پر منافقین کے استہزا وطعن وتشنیع اور بھی نمک چھڑکتے جاتے تھے۔ پس کمال نیازمندی، انتہائے تذلل وانکسار سے قلوب مؤمنین

اپنے اُس قادرِ قیوم کے جناب میں جس کی ہستی و یکتائی کا کلمہ پڑھ چکے تھے ملتجی تھے کہ خداوندا اپنے اس سچے دین کو غلبہ عطا فرما اور کفر و شرک سے اپنے اُس بیت معظم و مکرم کو جس کی بنیاد تیرے خلیل نے اپنے ہاتھ سے ڈالی تھی پاک فرما۔ یہ اُن سوختہ دلوں کی آرزوئیں تھیں جنھیں جینا اور مرنا خدا کے لیے سکھلایا گیا تھا۔ جن کی نگاہوں نے وہ کچھ دیکھ لیا تھا جس کے دیکھنے کے بعد تمام فانی زینتیں اور منعدم ہونیوالی لذتیں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ اب اُن کی نگاہوں کے آگے جو کچھ تھا سو ایمان و اسلام تھا۔ اسی کی عزت عزت تھی، اُسی کی زینت زینت اُسی کا بقا بقا، دیگر ہیچ ہیچ۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ رحمت رحمٰن و رحیم اُن کی تمنّاؤں کو لبیک نہ کہتی۔ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (یعنی ہم دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتے ہیں) کا ظہور نہوتا۔ دریائے رحمت الٰہی موجزن ہوا۔ غبارِ ملالِ خاطرِ آشفتگان سے دھلنے لگا، مجروح دلوں پر مرہم کافور رکھا جانے لگا۔ ہنوز مدینہ طیبہ پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ جبریل امین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور یہ مژدہ جانفزا اور کلامِ روح پرور سنایا۔ "اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا" اے میرے حبیب کھلی اور روشن فتح کا تجھے مالک بنا دیا نعمائے الٰہی کا ہر طرح تجھ پر اتمام ہوا۔ ذرا الفاظ قرآنی کی طرف غور فرمائیے کہ کیسے زوردار لفظوں میں یہ خوشخبری پہنچائی گئی۔ پھر یہ بھی غور کرو کہ فتح کی صفت مبین فرمائی یعنی روشن اور واضح تاکہ دوست دشمن موافق و مخالف سبھی جان لیں کہ سرتاج رسل صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح حاصل ہوئی۔ اور لفظ فتح کو نکرہ لایا تاکہ ہر طرح کی فتح بالعموم رسول کی ملکیت سمجھی جائے۔ علمی، اخلاقی، صنعتی، سیاسی دینی وغیرہ۔ اللہ اللہ ایک وہ نفوس قدسیہ کی جماعت تھی جن کے غبارِ خاطر کو اس طرح رب العزۃ نے دور فرمایا۔ ایک ہم بھی کلمہ گو ہیں کہ جن کے دل سے صدق و صفا ایسا ہی سلب ہو گیا ہے جیسا صحابؓ کے قلوب سے معصیت و عصیان۔ پھر جو کچھ ہوا وہ اُسی اخلاص کا نتیجہ تھا اور جو کچھ اب ہو رہا ہے یہ ہمارے افعال زشت کا ثمرہ ہے۔

چوں براری از میانِ جاں خروش — اندر آید بحرِ بخشایش بہ جوش

تا نہ گرید ابر کے خندد چمن — تا نہ گرید طفل کے جوشد لبن

بہرحال یہ اللہ کا وعدہ تھا جس کا ایک ایک حرف اُن مخلص نیازمندوں کے حق میں صادق ہو کر رہا جنھوں نے رضائے الٰہی کے لیئے اپنی ہستی، اپنے جذبات، اپنی تمنّائیں سب کی سب گم کر دیں اور پھر وہ سب کچھ پایا جو پانے کے قابل تھا۔ اَللّٰھُمَّ ارْضَ عَنَّا بِحُرْمَتِهِمْ اس آیہ کریمہ کے مضامین کے متعلق

ایک مختصر تمہید تھی جس میں اس سورۂ مبارکہ کا شانِ نزول بھی مذکور تھا۔ اس سے یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی کہ انسانی کامیابی کا کیا راز ہے اور کامیاب زندگی کے کیا معنی ہیں۔ لیکن مختلف طبقات کے اشخاص کا خیال کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر واضح تفسیر اس آیۂ شریفہ کی کی جائے۔

حضرت ربّ العزت جل جلالہٗ نے اس آیۂ کریمہ میں اپنی توحید و الوہیت اور نبوۃ و رسالت کی دلائل قاہرہ بیان کرتے ہوئے اُس دینِ الٰہی کے متعلق جس کی ابتداً حضرت آدم سے اور انتہا حضرت خاتم النبیین ؐ سے ہوئی حالت بیان فرماتا ہے۔ اُس کے بعد اُن خوش نصیبوں کا ذکر اور اُن کے حالات جمیلہ کی مدح فرماتا ہے جنھوں نے نہایت استقامت سے اس دینِ الٰہی کو لبیک کہا تھا۔ مُبارک ہیں وہ بندے جو مصداق اس آیۂ کریمہ کے ہوئے اور قابلِ تقلید ہے وہ حالت جس کی مدح سرائی کلامِ الٰہی میں ہوئی۔ وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (ریس کرنے والوں کو اس امر میں ریس کرنا چاہیئے۔) آیۂ کریمہ کے حصۂ اولیٰ (توحید و الوہیت) کے سمجھنے کے لیے ایک مختصر مقدمہ کی ضرورت ہے۔ پہلے اس پر اچھی طرح غور فرمالیں۔

فلسفۂ عملی و فلسفۂ نظری

حضرات! عالم میں جس قدر چیزیں کہ پائی جاتی ہیں خواہ جوہر ہوں یا عرض وہ دو حال سے خالی نہیں بعض تو ایسی ہیں جن کا وجود ہماری قدرت و اختیار میں ہے جیسے علم صدق دیانت وغیرہ وغیرہ۔ اور بعض ایسی ہیں جن کا وجود ہماری قدرت و اختیار میں نہیں جیسے آفتاب زمین ضوءِ شمس و قمر وغیرہ وغیرہ۔ پہلے قسم کے علم کو فلسفۂ عمل اور دوسرے قسم کے علم کو فلسفۂ نظر کہتے ہیں۔ پہلے قسم کو فلسفۂ عمل اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں مجرّد علم کمالِ نفسانی کے لئے کافی نہیں ہوتا ہے بلکہ اُس پر عمل ہونا بھی شرط ہے۔ مثلاً ایک شخص اتفاق کے معنی جانتا ہے اور اُس کے فوائد کا بھی اُسے علم ہے لیکن اُس پر عمل آرا نہیں ہوتا تو عمر بھر اُسے وہ فوائد حاصل نہ ہونگے جو اتفاق سے وابستہ ہیں اور یہ علم قطعاً اُس کے نفس کو مہذب نہ بنائیگا۔ پس حکمتِ عملی کے لئے ضرور ہے کہ اولاً اچھی باتوں کا علم حاصل کیا جائے اور بعد علم کے اُس پر عمل کی عادت ڈالی جائے تاکہ نفس اُن پاکیزہ عادتوں پر ملکہ ہو جائے۔ رہا فلسفۂ نظر سو یہاں صرف علم موجبِ کمالِ نفس ہوتا ہے یعنی ایسے موجودات جن کا وجود ہماری قدرت و اختیار میں نہیں ہے۔ اُن کے حقائق کا علی قدرِ طاقتِ بشری جاننا کمالِ نفس کے لیے کفایت کرتا ہے۔ آج دُنیا میں انھیں حقائق کے اکتشافات کا نتیجہ ہے جو محیر العقول کرشمے تم دیکھ رہے ہو۔ فَسُبْحَانَ الَّذِیْ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (پس پاک ہے وہ ذات جس نے انسان کو وہ باتیں سکھلا دیں جنھیں وہ نہ جانتا تھا)

بعد اس کے کہ فلسفۂ عمل و فلسفۂ نظر کی تعریف و غایت معلوم ہو چکی ہیں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ جس نے اپنے آپ کو فلسفۂ عمل سے متصف کیا ہوگا کیا اُس کی نظر سے یہ بات چھپی رہ سکتی ہی کہ جس نے اس شئے کو پیدا کیا اور ان صفات و اخلاق سے نفس کو متصف کرنیکی ہدایت فرمائی بیشک وہ ایک بڑا حکیم و علیم ہی۔ ہاں یہ امر بھی یہاں پر سمجھ لینے کے قابل ہی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں جسقدر جذبات و قوتیں کہ ودیعت فرمائی ہیں ان میں سے ہر ایک ضروری و انتہائی درجے کی مفید ہے۔ اُن کا بیجا استعمال بے محل صرف البتہ اُنھیں مذموم بنا دیتا ہی۔ مثلاً ایک جذبہ غیرت ہی کہ جب تک اس جذبہ کو اُس صحیح دائرہ تک رکھئیے محمود ہی لیکن افراط کے مرتبہ میں پہنچکر غضب و جنون کہا جاتا ہی اور تفریط میں آکر بے غیرتی و بے حمیتی۔ جسقدر غور کروگے اُسی قدر یہ مسئلہ واضح ہوتا جائیگا کہ افراط و تفریط سے اگر کام نہ لیا جاوے تو پھر انسان میں کوئی جذبہ و قوۃ مذموم نہیں اور جذبات کو اعتدال پر قایم رکھنا اصل کمال انسانی ہی۔ اب کیا وہ شخص جسکی زندگی کا دستور العمل فلسفۂ عمل ہو کیا اس امر کا اعتراف نہ کریگا کہ جس نے ان جذبات و قوتوں کو پیدا کیا وہ ایک عجیب بے مثل ذات ہی اور اُس کی حکمت کی حقیقت تک پہنچنے سے انسان عاجز ہی۔ اسی طرح جس نے کائنات کے صحائف کا مطالعہ کیا ہوگا اور جمادیات حیوانات ان میں سے کسی کی صنعت کی طرف غور و فکر سے کام لیا ہوگا تو قدرۃ کے عجائبات نے اُس کی عقل کو متحیر فکر کو سراسیمہ بنا دیا ہوگا۔ اور بیساختہ اُس کے مُنھ سے یہ نکل گیا ہوگا۔ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ۔

مشاہدۂ اشیا سے سبق

صبح کے وقت کسی چمن میں جاؤ وہاں کا سماں دیکھو سبزوں کا لہلہانا غنچوں کا شگفتہ ہونا۔ مختلف پھولوں میں مختلف رنگ و بو کا پایا جانا۔ کیا یہ سب تمھیں اس طرف رہبری نہ کرینگے کہ عالم کا کوئی صانع ہی۔ ایک گلاب کے پھول کو لو۔ اُس کی نزاکت اُس کی باس اُس کی رنگت، اُس کی پنکھڑیاں اُن پنکھڑیوں کے ریشے کیا اپنے خالق کا پتہ نہیں دیتے ہیں یا اُس کے کمال صنعت کو اپنے وجود سے ثابت نہیں کرتے صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی کاریگری ہی جس نے ہر چیز کو مستحکم بنایا ہی کیا کسی نے آج تک ایک پھول بھی ایسا بنایا جو ان تمام صفات ظاہری و باطنی میں گلاب کے مانند ہو اور اسی طرح اپنے آپ میں روح نباتی بھی رکھتا ہو۔ ہرگز نہیں۔ اطبا سے پوچھو تو تمھیں معلوم ہو کہ گلاب اپنے رنگ و بو حُسن و جمال کے علاوہ کیا کیا خواص رکھتا ہی۔ کتنے امراض میں کام آتا ہی اور کس کس طرح بہترین ادویات کا جز بنکر صحت و راحتِ انسانی کا سبب ہوتا ہی۔ کسی بڑے سے بڑے

فلسفی سے التجا کرو یا کسی ماہرِ علمِ نبات سے التماس لاؤ کہ ایک پھول بھی ایسا بنا دے جس میں گلاب جیسے اوصاف پائے جائیں۔ اچھا اگر تمام عمر کی کوشش سے ایک پھول اُس نے بنا بھی لیا تو یہ خواص اُس میں پیدا نہونگے۔ اور بفرضِ محال اگر اُس میں خواص عجیب مان بھی لیے جائیں تو اُس کے استعمال میں یہ تنوعاتِ مفیدہ نہ پائے جائینگے۔ اور سب کچھ سہی مگر وہ حیاتِ نباتی جو اپنے آپ میں ایک گلاب کا پھول رکھتا ہے وہ کہاں سے پیدا ہوگی۔ ایک طرف ماہرانِ فن کا یہ عجز دوسری طرف اُس قادر و قیوم کی قدرت کا یہ جلوہ کہ ہر صبح کو کروڑوں پھول اُسی آب و تاب اُسی خواص و طبائع کے ساتھ چمنستانِ عالم میں شگفتہ ہو کر اپنے خالق کی تسبیح و تقدیس زبانِ حال سے کرتے ہوئے کچھ دیر اپنی بہار دکھا کر کل کے آنیوالوں کے لیے جگہ خالی کر رہے ہیں۔ اور ایک غیر محسوس طرز پر اُسی کے پاس چلے جا رہے ہیں جس نے اُنھیں یہاں چند ساعتوں کے لیے بارونق بنا کر بھیجا تھا۔ فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝
(پاک ہے وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور تمام اشیا اُسی کی طرف لوٹتی جاتی ہیں)

اِسی طرح ایک علم الابدان کے ماہر کو لو اور اُس سے پوچھ دیکھو کہ تشریحاتِ اعضائے انسانی میں اُس کی عقل تو اورات کا مشاہدہ کرتے ہوئے کیسی متحیر رہ جاتی ہے۔ ایک ایک عضو اپنی صورت بلحاظ اپنے خواص اپنے افعال اور اپنے محلِ وقوع کس حکمت سے مخلوق کی گئی ہے۔ مثلاً آنکھ کی پہلی ساخت کی طرف غور کرو اُس کی نزاکت کو دیکھو پھر اُس کے محلِ وقوع پر نظر ڈالو پھر قدرت نے جو اُس کے محفوظ رہنے کی تدابیر عمل میں لائی ہیں اُسے سوچو اُس کے بعد دیکھنے کے فلسفے پر فکر دوڑاؤ اور اس دیکھنے کے لیے خالق نے آنکھ میں کیا کیا کل پرزے بنائے ہیں اُسے مطالعہ کرو پھر تم خود ہی کہہ اُٹھو گے کہ سراپا حکمتوں سے مرقع وجود محض امتدادِ دہر یا اتفاقاتِ ایام یا تنوعاتِ حرکت کا نتیجہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ یہ ترتیب و یہ نظام کسی بڑی قدرت والے ذی اختیار کا کام ہے بیشک ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝

قرآن اور فلسفۂ عملی و نظری

حضرات! اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ میں آپکے سامنے اُس کتاب آسمانی کی عظمت جسے ہمارے پیغمبر روحی فداہ ہم میں امانت فرما گئے ہیں ظاہر کروں۔ دیکھیے فلسفہ نظر کا جاننے والا مرتبے میں فلسفہ عمل کے عالم سے اعلیٰ سمجھا جاتا ہے اور یہ امر مسلّم ہے کہ فلسفہ نظر میں جو حصہ کہ سب سے اہم تر و معرکۃ الآرا ہے وہ فلسفہ الٰہی ہے تو اب مجھے یہ بتلانا ہے کہ جس طرح سے کتاب اللہ نے فلسفہ عمل میں ہمیں تمام فلاسفہ کی تصانیف سے بے نیاز کر دیا ہے اُسی طرح فلسفہ نظر کی

حصۂ الٰہیات میں ہم کسی کے محتاج و منت مند نہیں ہیں۔ فلسفۂ الٰہی کا بڑے سے بڑا عالم جہاں تک پہنچا ہی یا پہنچیگا آج سے چودہ سو برس قبل ہمیں قرآن حمید وہاں تک پہنچا چکا ہی۔ اس کو ذرا واضح طور پر یوں سمجھیئے کہ وجودِ باری پر حکما نے جو دلائل کہ قایم کیئے ہیں وہ تین نوعیتوں میں منحصر ہیں۔ امکان، حدوث، اور نظام و ترتیب۔ یعنی جواہر و اعراض کا ممکن ہونا اس امر کی دلیل ہی کہ ان کے وجود کا راجح کرنیوالا کوئی ہی اور وہ خود دائرۂ امکان سے خارج ہی، ورنہ دور و تسلسل لازم آئیگا اسی طرح جواہر و اعراض کے تغیر سے اُن کے حدوث پر دلیل لاتے ہیں اور یہ طے شدہ امر ہی کہ ہر حادث کے لیے ایک محدث چاہیئے جو خود حادث نہو بلکہ قدیم ہو۔ ورنہ وہی خرابی دور و تسلسل کی یہاں بھی لازم آئیگی۔ تیسرا طریقہ نظام عالم سے استدلال کرنے کا ہی۔ حکما اس کی تقریر یوں کرتے ہیں کہ تمام جسم خواہ فلکی ہوں یا عنصری جسم و لوازمِ جسم میں یکساں ہیں۔ پھر اُن کا باعتبار صفات و اشکال و مقادیر و امکنہ و احیاز مختلف ہونا کس سبب سے ہی۔ جسم اور اُس کے لوازم کو تو کہا جا نہیں سکتا۔ اس لیے کہ جسم من حیثیتِ جسم اور لوازم جسم من حیثیت لوازم جسم کا اقتضا یکساں ہی۔ یہ اتفاق کو چاہیگا نہ کہ اختلاف کو پھر اب جو اختلاف پایا جاتا ہی تو وہ کسی امر منفصل کے جہت سے ہی۔ جو نہ جسم ہی نہ اس سے متعلق ہی پھر وہ مجبور بھی نہیں ہوسکتا اس لیے کہ مجبور تو مجبور ہی اُس سے صدور افعال کیونکر ہوگا۔ لامحالہ قادر و مختار ہی۔ پس وہ ذات جو قادر و مختار ہی اور جسم و جسمانیت سے پاک ہی اُس کا وجود ضروری ہی تاکہ اجسام کے مختلف صور و صفات وغیرہ وغیرہ سے نظام عالم قایم رہے اور وہی اللہ ہی۔ یہ منطقی پُر پیچ تقریر کوئی سمجھا ہوگا اور کوئی اُلجھ کر رہ گیا ہوگا کہ یہ کیا بکواس و چیستیاں ہی اور جس نے سمجھا بھی ہوگا تو اُس کے قلب کو سکون پیدا ہوا ہو یا نہوا ہو۔ اب آیئے اس طرف۔ ہم آپ کو یہ دکھلائیں کہ قرآنِ پاک کس طرح ہمیں اس اہم مسئلہ کو سمجھاتا ہی۔ اَللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ۔ بے نیاز ذات اللہ تعالیٰ کی ہی اور تم سب کے سب محتاج ہو۔ ذرا اسی آیہ پر غور کرلو یہ ہر شخص جانتا ہی کہ انسان سراپا احتیاج و مجسمۂ حاجت ہی۔ اب یہ اپنی حاجتوں کو رفع کرنے کے لیے جس کی طرف رجوع کرتا ہی وہ سب مخلوقات الٰہی ہیں۔ اور وہ بھی اپنے وجود کے بقا اور حفظ تشخص میں کسی کی طرف محتاج ہیں۔ دیکھو یہ وہی امکان کا مسئلہ ہی مگر حکما کے یہاں دور و تسلسل کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہی اور قرآن نے ایک دلکش جملہ اللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ فرما کر ہمارے امکان ہمارے تغیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا قدیم و قادر ہونا بھی ثابت کردیا اور یہ بھی تبلادیا کہ احتیاج و درماندگی میں تمھارا اصل مرجع کون ہونا چاہیئے

قرآن کا طرز استدلال

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا قصہ قرآن پاک میں موجود ہے۔ آپ نے چار مرتبہ مناظرہ فرمایا پہلا مباحثہ بظاہر اپنے نفس سے تھا اور حقیقت میں قوم مخاطب تھی۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰى كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ فَلَمَّا اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (جب کہ رات کی تاریکی نے چھپالیا اور ستارے درخشاں ہوئے تو اُس نے کہا کہ یہ میرا رب ہے لیکن جب کہ وہ غروب ہوگیا تو اُس نے کہا کہ میں غروب ہوجانے والے کو پسند نہیں کرتا) دوسرا مباحثہ اپنے باپ سے فرماتے ہیں۔ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِیْ عَنْكَ شَيْئًا (اے باپ جو چیز نہ دیکھ سکے نہ سن سکے نہ تجھے کچھ بھی کسی سے بے نیاز کر سکے اُس کی عبادت کیوں کرتا ہے) پہلے مباحثہ میں حدوث و تغیر سے صانع عالم پر استدلال کرتے ہیں۔ دوسرے میں مجبوری باطل معبودوں کی ظاہر فرما کر اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ معبود کو قادر مطلق ہونا چاہیئے۔ تیسرا مباحثہ قوم سے ہے۔ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِیْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (یہ مورتیں جنکی پرستش پر تم جمے بیٹھے ہوئے ہیں کیا چیز؟) یہاں یہ بحث پیش کرتے ہیں کہ مخلوق کسی حال میں معبود نہیں ہوسکتا۔ معبود کسی کے بنانے سے نہیں بنتا ہے بلکہ معبود تو وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔ اور ان تمام چیزوں کو نیست سے ہست بنا دیا۔ چوتھا مباحثہ نمرود سے ہے۔ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ يُحْیٖ وَيُمِيْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِيْتُ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (جب ابراہیم نے نمرود سے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔ تو اُس نے کہا میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ تب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب مشرق سے آفتاب کو طلوع کرتا ہے تو اُسے مغرب سے نکال دے پس کافر حکیرا کر رہ گیا۔ اللہ ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا) یہ دلیل نظام و ترتیب عالم سے ہے۔ ابراہیم خلیل اللہ کی زبان سے جن دلائل کو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اُن کی سادگی کو دیکھو۔ پھر اس کو خیال کرو کہ کس طرح دل میں گھر کر جانے والے استدلالات ہیں۔ پس میرا یہ کہنا کہ حکمائے دہر کی عقلیں انتہائے کار میں جہاں پہنچیں اور اُن کے فکر کی جو آخری منزل ہوئی۔ وہ اُن کے لیے اگرچہ جتنا بھی مایۂ ناز و فخر ہوا ہو۔ لیکن ہم تو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس قبل ایک نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے دو سوکھے پہاڑوں میں ولق افروز ہو کر یہ سب کچھ پڑھا دیا۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى هٰذَا النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ ط

حامیانِ علوم عقلیہ کا ایک مغالطہ

ہاں اس قدر اور بھی گزارش کرونگا کہ جہاں کہیں بھی الہیات کے باب

ہیں حکما کی رائیں راستی کی طرف گئی ہیں وہ شمع نبوۃ کے نور ہی کا جلوہ ہے۔ نبیوں کے مُنھ کی نکلی ہوئی باتیں جب ان حکما تک پہنچیں تو اُس کی مقاومت کی طاقت اپنے میں نہ پاکر اُنھیں باتوں کو اپنے الفاظ کے قالب میں ڈھال لیا۔ چند رعب دار مصطلح الفاظ کی ثقالت سے اُسے پر پیچ بنا کر اپنا کہکر لوگوں کے سامنے لے آئے۔ اب جو کوئی اُس کو پڑھتا ہے اُن کے کمالِ عقل و فکر رسا ہونے کا قائل ہو کر اُن کے قول کی عظمت کرنے لگتا ہے۔ اس طرح اُن کی وہ تمام باتیں جو اُن کی اختراعیات ہوتی ہیں اور اُن کے مظنونات و قیاسات کا صرف ایک انبار ہوتے ہیں وہ سب کو صحیح جاننے لگتا ہے۔ یہ پہلا مغالطہ ہے جو حامیان علوم عقلیہ کو پیش آتا ہے۔ اور جب تک اس غلطی کا ازالہ نہیں ہوتا اور اُن کے قدم اپنے دائرہ و حدود کے اندر نہیں آتے اُس وقت تک ہمیشہ ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ جب معلوم کی اساس ہی غلطی پر ہو تو پھر صحت نتیجہ کی امید ہی عبث ہے ؂ خشتِ اوّل چون نہد معمار کج ٭ تا ثریا می رود دیوار کج۔

دوستو! اس مسئلہ کا بیان ذرا واضح ہونا چاہیئے تاکہ اگر کوئی مسلمان کی دل داس غلطی میں مبتلا ہو تو اُسے تنبیہ ہو جائے۔ دیکھیئے جب ہم ایک مہندس کے پاس بیٹھتے ہیں اور ریاضیات کے مسائل میں اسکی موشگافیاں اور پرپیچ اشکال میں اُس کے ذہن کی جودت دیکھتے ہیں اور پھر نتائج صحت کیساتھ یقین دلانے والے ہوتے ہیں تو ہمارا دل اس کی عظمت و کمال کے سامنے جھک جاتا ہے اور اُس کے صحیح العقل و فکر رسا کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اب وہ اپنے حدود و معلومات و تبحر سے قدم باہر نکالتا ہے اور مذہب کے میدان میں آتا ہے۔ یہاں آکر اپنی بیباکی سے کچھ کہتا ہے تو ہماری عقیدت سابقہ اس امر پر ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اس ماہر کی تحقیق سے انکار نہ کیا جائے۔ جس کی عقل ایسی دُوربین ہو کیا اُس کی نظر سے ایسی جلی باتیں مخفی رہ سکتی ہیں؟ نہیں کبھی نہیں۔ بس یہی فیصلہ تمام اغلاط کا سنگ بنیاد ہو جاتا ہے۔ حالانکہ تھوڑے غور و فکر سے کام لیا جائے تو یہ مسئلہ نہایت ہی آسانی سے صحیح اُصول پر فیصل ہو سکتا ہے۔ یعنی ایک شخص جو ریاضی کا جاننے والا ہے وہ امراض کی تشخیص اور معالجہ کی تجویز میں جب کہ بالکل عاجز ہے اور اُس کی عقل نہ تو ایک محموم کی تپ کی نوعیت متعین کر سکتی ہے اور نہ اُس کا علاج تجویز کر سکتی ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مذہب کے باب میں اُس کی رائے ویسی ہی وقیع سمجھی جائے جیسی کہ علم ریاضی میں۔ نیز اگر کوئی بہت بڑا ریاضی داں اعلیٰ درجہ کا طبیب حاذق بھی ہو تو کیا تشخیص امراض و تجویز علاج کے وقت اُس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ اپنی تشخیص و تجویز پر اُسی طرح قطعی دلائل قایم کریں جیسا کہ آپ علم ہندسہ کے متعلق کیا کرتے ہیں۔

الغرض یہ امر بداہتًا ثابت ہے کہ ہر وجود کا ثبوت ایک ہی نوعیت پر نہیں ہو سکتا ہے۔ نیز ایک فن کی مہارت سے دوسرے فن کا علم لازم نہیں آتا ؎

بوریا باف گرچہ بافندست
نہ برندش بہ کارگاہ حریر

فیثاغورث کی ایک حکایت

ایک واقعہ بطور مثال گزارش ہے۔ فیثاغورث جو ایک بڑا حکیم دور قدیم میں تسلیم کیا گیا ہے اور جس کی تحقیقات پر آج یورپ کی انتہائے فکر نے قرار پکڑا ہے (یعنی یہ کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے) اس مسئلہ کی اہمیت اس کے ذہن کی حدت کی کافی شہادت ہے۔ لیکن مذہب میں آکر ایسی فاش غلطی کرتا ہے کہ تمام فلسفہ یہاں دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ یہ حکیم تناسخ کا بھی قائل تھا۔ ایک دفعہ کوئی شخص ایک کتے کو مار رہا تھا اور کتا چیختا جاتا تھا۔ فیثاغورث وہاں سے گذرا۔ اس نے اس شخص سے کہا کہ اس کتے پر میری وجہ سے رحم کرو۔ اس میں میرے ایک دوست کی روح نے جنم لیا ہے اور میں اسے پہچانتا ہوں۔ قابل غور ہے کہ اولًا تناسخ کا قائل ہونا۔ پھر ایک کتے میں اپنے دوست کی روح کا حلول یقینی طور پر تسلیم کرنا اور اسے اذعان کے ساتھ پہچاننا اور اس بنا پر رحم کا خواہاں ہونا، کیا بچوں جیسی باتیں نہیں ہیں؟ ایسا زبردست حکیم اور اس طرح کی باتیں۔ اس سے عقل انسانی کی پرواز معلوم ہو جاتی ہے۔

لمعاتِ کلام ربانی

یہ مضامین جو مشتے نمونہ از خروارے بیان کیے گئے ان سے مقصد صرف اسقدر تھا کہ کلام ربانی کے لمعات آج بھی فلسفہ جدید کے سامنے ویسے ہی درخشاں و نور افشاں ہیں جیسے کہ اب سے چودہ سو برس پہلے تابان و ضیا افگن تھے۔ ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

بلکہ صحیح فلسفہ دانی کا نتیجہ توحید و الوہیت کا اعتراف ہے۔ اور قرآن مجید کے ساتھ دلی شیفتگی و فریفتگی نہ کہ وجود باری کا انکار اور فہم و تلاوتِ کلام اللہ سے بیگوئی و بیزاری۔

اب بعد سمجھ لینے دلائل توحید و الوہیت کے ایک نظر اس آیہ کے لفظ هُوَ الَّذِي پر ڈالیے جو دو لفظوں میں تمام براہین و دلائل کو اپنے آپ میں سمیٹے ہوئے ہے۔

اس ضمیر (ہُوَ) نے کیسا آپکے دل کو روشن اور اس اسم موصول (اَلَّذِیْ) نے کس طرح آپ کو واصل اس مقام کا کر دیا جہاں تک پہونچنے کی تمنا عقلائے دہر کو فنا ہوجانے کے بعد بھی باقی رہی ؎

دل نگہدار از خیالِ غیر دوست
روز و شب از بہر او کن ہا و ہو

اس سے زائد میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مضامین بہت ہیں اور دل میں بہت کچھ کہنے کی آرزو ہی مگر کیا کیجئے افسوس ؎

مرے درد دل کے ترانے بہت ہیں
شبِ وصل کم ہی فسانے بہت ہیں

مسئلہ رسالت

اب بیانِ رسالت کا شروع ہوتا ہی۔ چھ سات لفظوں میں مسئلہ رسالت کا براہین و استدلال کے ساتھ بیان کر دینا تو خدا ہی کا کام ہی۔ میں اسقدر جامع ترجمہ کرنے سے مجبور ہوں۔ نہ تو اردو زبان میں اس طرح کثیر معنی کو سمیٹنے والے الفاظ ہیں اور نہ مجھے ایسی قدرت حاصل ہی پس لامحالہ اس کے ترجمہ و تفسیر سمجھانے میں مجھے آپکے وقت کا ایک کافی حصہ لینا ہوگا۔ اور امید کرتا ہوں کہ اخیر میں آپ بھی اپنی اس عطا سے ناراض نہونگے۔

مسئلہ رسالت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنیکے لیے پہلے اس مقدمہ کو سمجھئے کہ اجل ترین موجودات بالاتفاق بنی آدم ہی لیکن یہ ایک عجیب لطف ہی کہ آدم کی اولاد جب کتم عدم سے حیز وجود میں آتی ہی تو ہر طرح کے وہ سامان لوازم جو حیات کے لیے یا اپنے ماسوا سے بہرہ مند ہونیکے لیے اسے چاہئیں ان میں سے ایک بھی اسکے پاس نہیں ہوتا۔ ہر شے کے حصول کے لیے اسے ایک زمانہ اور مدۃ معینہ چاہیئے اور پھر یہ کہ قدم قدم پر ایک معلم کی تعلیم اسکی دستگیر ہو۔ برخلاف اسکے دیگر حیوان ہیں جو انسان کے جسم میں مشارک ہیں۔ وہ اپنے وجود کیساتھ تمام وہ سامان جو انھیں حر و برد سے محفوظ رکھے دشمن کے حملے سے بچا سکے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ اپنی غذا کی تمیز انھیں پیدائش کیساتھ ہی ساتھ ہوتی ہی۔ ہر حیوان کو تم دیکھو گے کہ وہ اپنی غذا دانکو پہچانتا ہی۔ اپنے دشمن کو شناخت کرتا ہی۔ اپنے پر یا سرعت قدم کی مدد سے دشمن کی زد سے بھاگ سکتا ہی۔ یا پنجہ و دندان سے اپنی اُنسے مدافعت کرسکتا ہی۔ غرض حیوان کو جو کچھ بھی ہونا ہی وہ سب یکبارگی ہوجاتا ہی۔ اور چونکہ اسکی تمام تر ترقی صرف اس امر میں منحصر کہ وہ اپنی نوع کو قائم و باقی رکھے اس لیے اُسے صرف خزانہ الٰہیہ سے اُسقدر چیزیں جو دیکھتا ہی ساتھ عطا کر دیجاتی ہیں جنکا ہونا تحفظ وجود و بقائے نوع کے لیے ضروری تھا۔ مگر انسان جو اپنی پیدائش کیوقت سادہ محض ہوتا ہی اسکے وجود کا مقصد صرف یہی نہیں ہی کہ یہ اپنے آپ یا اپنی نوع کو قائم و باقی رکھے بلکہ اسکی سطح اس سے کہیں بلند تر بنائی گئی ہی۔ اسلیے وہ اس عالم میں آکر بتدریج آہستہ آہستہ

ایک ایک چیز کا عالم ہوتا جاتا ہے اور اپنی ترقی کی رفتار مہد سے لیکر تا لحد جاری رکھتا ہے جس انسان نے اپنے خلق کے اس راز کو سمجھا وہی توحقیقتاً انسان رہا ورنہ اُس کا وجود صورتاً انسان اور حقیقتاً حیوان سے بدتر ہے اس مسئلہ کا فی بیان تقریر آیندہ کے کسی حصہ میں آئیگا۔ اس وقت مجھے صرف مسئلہ تعلیم کی طرف آپ کو متوجہ کرنا ہے تاکہ صرف ضرورت سالت اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

احتیاج معلّم

انسان میں پانچ حواس ظاہری (لامسہ۔ باصرہ۔ سامعہ۔ ذائقہ۔ شامّہ) اور پانچ حواس باطنی (حس مشترک۔ وہم۔ خیال۔ حافظہ۔ متصرفہ) ودیعت رکھے گئے ہیں اور یہ حواس عشرہ کم وبیش سب میں پائے جاتے ہیں ہر حواس کا کام علیحدہ ہے اور ہر ایک کا ان میں سے ادراک جداگانہ۔ ایک حواس اگر ضائع ہوجائے تو دوسرا اُس کا قایم مقام ہوکر اُسکے کام کو انجام نہیں دے سکتا سب سے پہلے انسان میں حس لامسہ پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ حواس کام کرنا شروع کردیتا ہے تو انسان کو اُس عالم کا علم ہونا شروع ہوجاتا ہے جس کا تعلق حس لامسہ سے ہے۔ اس کے بعد حس باصرہ پیدا ہوتی ہے اور اب ایک دوسرے عالم کا علم جو پہلے سے بہت زائد وسیع و دلفریب ہے اُس کے معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ پھر حس سامعہ اُس میں پیدا ہوکر نغمات و اصوات کا عالم اُسے بناتی ہے۔ اُس کے بعد حس ذائقہ اس کے بعد حس شامہ۔ الغرض پانچ حواس آہستہ آہستہ یکے بعد دیگر انسان میں پیدا ہوکر اُسے پانچ عالموں کا عالم بنا دیتے ہیں۔ اب جب کہ وہ تقریباً سات برس کا ہوتا ہے تو اُس میں ایک دوسرا حاسہ پیدا ہوتا ہے جسے تمیز کہتے ہیں۔ اور اب اس قوت تمیز سے وہ اُن اشیا کا علم حاصل کرتا ہے جس کے تبلانے سے حواس بالکل عاجز تھے اس کے بعد ایک اور نیا حاسہ اُس میں پیدا ہوکر اُسے ایک اور ہی عالم میں پہنچاتا ہے اور اس کا نام عقل ہے۔

اب اس تمام مدت میں اگر انسان کو کوئی شفیق ولائق معلّم ملجائے اور علوم مفیدہ کا اُسے افاضہ کرے تو وہ ان نعمائے الٰہیہ کو (جو حواس و تمیز و عقل کی صورت میں اُسے عطا کی گئی ہیں) ان کو ایسا کام میں لاتا ہے کہ خلقت انسانی کے بعض مقاصد ایک حد تک پورے ہوجاتے ہیں۔ اور اگر کوئی اُستاد نہ ملا اور اسکی تعلیم صحیح اُصول پر نہوئی تو تمام نعمتیں برباد ہوجاتی ہیں۔ اور ایک حیوانی زندگی اُس کی رہ جاتی ہے۔ ایک یہ بدیہی بات ہے۔ اور مشاہدات اس پر شاہد عادل کہ انسان اپنے تمام لوازمات زندگی و معاشرت میں کسی معلم کا محتاج ہے اور یہ کہ اچھی معاشرت و متمدن زندگی تعلیم ہی کا نتیجہ ہے۔ جنھیں تعلیم نصیب نہیں ہوئی اُن کی زندگی پہاڑوں اور جنگلوں میں جاکر دیکھنی چاہیئے۔ نہ مکان ہے نہ لباس۔ نہ کھانے کا طریقہ نہ رزق حاصل کرنیکے اصول

انھیں معلوم ہیں۔ غرضکہ جسقدر انسان میں دائرہ تعلیم و تعلم کا وسیع ہوگا اُسی قدر وہ اپنے تمام حواس سے اُمد مفید کام لے سکیگا۔ لیکن انسان کی ترقی اسی جگہ ختم نہیں ہوجاتی ہنوز ایک بڑا حصہ اُس کی زندگی کا ناتمام ہی اور اُس حصہ کے تکملے کے لیے نہ حواس عشرہ کام دیتے ہیں۔ نہ قوت تمیز فائدہ پہنچاتی ہی نہ عقل ہی پوری رہبری کرتی ہی۔ مولنٰا روم اُن جذبات کو بیدار کرنے کے لیے اس طرح اشارہ فرماتے ہیں۔ سہ

پنج حسّے ہست جزایں پنج حس + آں چوزر سُرخ وایں حسہا چومس

آئینہ دل چوں شود صافی و پاک + نقشہا بینی بروں از آب وخاک

حاسہ رسالت و نبوت

یہ حصۂ زندگانی انسان کا وہ عظیم الشان حصہ ہی۔ کہ بدون اُس کے تمام تعلیم و تعلم اور ہر شعبۂ زندگی کا ترقی پذیر ہونا عبث ولاسود ہی۔ اس حصہ کا تکملہ اس طرح ہوتا ہی کہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے کسی ایک کو منتخب فرماتا ہی اور اُسے ایک ایسا حاسہ عطا فرماتا ہی جس کے سامنے تمام حواس سابقہ دست طلب پھیلائے معاونت کے خواستگار ہیں۔ وہ حاسہ ان سب کے اغلاط کو پہچانتا ہی خطاکاریوں کو جانتا ہی ان کے موقع زلات سے آگاہ ہوتا ہی۔ جہاں کہیں یہ مغالطہ میں پڑجاتے ہیں یا تھک کر رہ جاتے ہیں تو وہ شخص (جسے منجانب اللہ وہ حاسہ عطا ہوا ہی) انھیں مغالطات سے آگاہ کرتا ہی اور اُن کے تاریک راستوں میں ایک شمع رکھتا ہی۔ منزل کو اُن پر آسان اور مطلوب کو اُن سے قریب کردیتا ہی۔ اس حاسہ کا نام نبوت و رسالت ہی۔ اور اُس شخص کو نبی یا رسول کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب اُس کو نبوت و رسالت عطا فرماتا ہی۔ تو پھر وہ ان چیزوں کو دیکھتا ہی جس کو ہماری آنکھیں کسی طرح نہیں دیکھ سکتی ہیں۔ وہ باتیں سنتا ہی جن کو سُننے سے ہمارے کان عاجز ہیں۔ وہ مضامین سمجھتا ہی جس کے تعقل سے ہماری عقول بے بہرہ ہیں وہ اعلیٰ علوم نہی نسبتِ فوقانی کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے سیکھتا ہی۔ اور خلق کو پھر وہ باتیں بتاتا ہی اور ایسی راہ صراطِ مستقیم کی دکھلاتا ہی کہ جس بات کے سمجھنے سے اور جس راہ کے پانے سے انسان بدون اس کی رہنمائی و رہبری کے مجبور ودرماندہ ہی۔ ہاں نورِ نبوت سے اگر انسان اپنی اُن مخفی قوتوں کو جس کی طرف مولنٰا رومؒ نے اشارہ فرمایا ہی (جسے صوفیہ لطائف کہتے ہیں) مستنیر بناتا ہی تو پھر وہ بھی عوام کی سطح سے اُسی قدر بلند ہوجاتا ہی جس قدر بصیر نابینا سے ارفع ہی۔ اس کا انکار بجز جاہل و متعصب کے کوئی کر نہیں سکتا۔ لہٰذا اب ہم دوسرے پہلو سے اس بحث کو صاف کرتے ہیں۔

ایک کامل دستور العمل کا معیار

انسان کی طبیعت تمدن کی مقتضی ہی۔ اور چونکہ تمدن اقتضائے طبیعت ہی،

اِس لیے ہر وہ اُصول جس کا تعلق تمدن سے ہو اور تمام وہ علوم جو تمدن کو بارونق بنانے والے ہیں انسان بالطبع ان کی طرف راغب و مائل ہوتا ہے۔ اور اسی تمدن کے اقتضائے طبعی ہونے سے علم انسان کے لیے ضروری ہوگیا۔ اب یہاں پر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ تمدن زندگی ایک بردست و کامل دستور العمل چاہتی ہے تاکہ معاملات باہمی میں ایک دوسرے کے حقوق کی محافظت رہے۔ ایک کی صنعت و حرفت و کمال سے دوسرا بغیر اس کے کہ جانبین میں سے کسی پر زیادتی ہو آپس میں متمتع ہوتے رہیں۔ انسانی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے جذبات کو اعتدال پر قائم نہیں رکھ سکتا۔ اور حق تو یوں ہے کہ جذبات پر قوت حاصل کرنا اور نہیں افراط و تفریط سے بچائے رکھنا نہایت ہی دشوار ہے۔ انسان کا اُس حال میں جب کہ نفس کا سخت حملہ ہوتا ہے عدل و انصاف پر قائم رہنا بہت ہی اہم و معرکۃ الآرا ہے۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ اُسے یہ معلوم ہو کہ مواخذہ کی نگاہ اُسے دیکھ نہیں رہی ہے۔ پس اب جو دستور العمل کہ حیات انسانی کے لیے مقرر کیا جائے اُن میں حسب ذیل باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ (اوّلاً) اُس کے دستور اور قواعد ایسے ہوں جو ہر طبقات انسان کے طبائع کے مطالعہ کے بعد بنے ہوں تاکہ ہر زمانے میں ہر مقام میں ہر اقوام میں وہ دستور العمل یکساں فائدہ پہنچائے (ثانیًا) وہ قواعد ایسے ہوں کہ جن پر عمل کرنا ممکن ہو اور اُس پر عمل کا لازمی نتیجہ فلاح و بہبود ہو (ثالثًا) یہ کہ اُس دستور العمل کی واضع وہ ذات ہو جس کی نسبت تمام آدمیوں سے یکساں ہو تاکہ اُس میں کسی جماعت کی رعایت کی قرابت یا ہم وطن یا ہم قوم ہونے کے سبب سے نہ کی گئی ہو۔ (رابعًا) یہ کہ واضع قانون کا علم اس قدر وسیع ہو کہ اُسے عمل کرنے والوں کے حال سے ہر آن خبر رہتی ہو۔ (خامسًا) یہ کہ اُس کا دائرہ حکومت اس قدر وسیع ہو کہ جس سے نکل کر بھاگ جانا محال ہو (سادسًا) اُس میں سزا و جزا کی قدرت تامہ ہو (سابعًا) سہو و نسیان کو قصد و ارادہ سے جُدا رکھ سکتا ہو (ثامنًا) اطاعت و عدم اطاعت کا اثر اُس کی ذات یا اُس کی سلطنت پر نہ پڑتا ہو (تاسعًا) کوئی دوسرا اُس کا کسی امر جزئی میں بھی شریک نہ ہو۔ الحاصل حیاتِ انسانی کے لیے کامل دستور العمل تو وہی ہو سکتا ہے جن کا بنانے والا ان کمالات سے متصف ہو۔ اور خود وہ دستور العمل اپنی ذات سے اس طرح جامع و سہل العمل ہو۔ اب تم خود غور کر لو کہ ایسا دستور العمل بنانا کیا امکان بشر میں ہے۔ کیا کوئی سلطنت سرًا و علانیۃً یہاں تک کہ افعال قلوب پر بجز علم الٰہی کے محیط ہے؟ کیا کوئی طاقت عالم شہد، عالم برزخ، عالم معاد تک سوائے قدرتِ خداوندی کے چھائی ہوئی ہے؟ کیا دنیا میں کوئی قوت ایسی ہے جس کا مقابلہ محال ہو۔ پس اسی لیے اس جل مجدہ نے جس نے انسان کو پیدا کیا

اُس میں جذبات عطا کیئے اس کی طبیعت میں تمدن کا اقتضا خلق فرمایا۔ اسی نے اُن کے لیے ایک کامل دستور العمل اپنے رسول کی معرفت بھیجا جس کو اصطلاح شریعت میں وحی و کتاب اللہ کہتے ہیں۔ اس کتاب مقدس میں اصلاح معاش و فلاح معاد کے اصول بتا دیئے۔ نیز اوامر پر عمل کرنیوالوں کو مژدۂ فضل و رنواہی پر جسارت کرنیوالوں کو اپنے عقاب کی تہدید بھی سُنا دی۔ اس سے بھی آگاہ فرما دیا کہ سرکشوں کو جو چند روز تک مہلت و دیگر متعات دُنیا کا حظ وافر دیا جاتا ہے اُس سے دھوکا نہ کھاجانا۔ وہ عذاب الٰہی کا پیش خیمہ و دیباچہ ہے۔ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ ط (جب اُن باتوں کو جو یاد دلائی گئی تھیں بھلا دیتے ہیں تو ہم ہر چیز کی کامیابی کے دروازے اُن پر کھول دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ ان کامیابیوں پر خوش ہونے لگتے ہیں تو ناگہاں ہم اس طرح اُنھیں پکڑ لیتے ہیں کہ بے آس ہو کر رہ جاتے ہیں۔)

جن قوموں نے نافرمانی اپنا تمغۂ افتخار بنا رکھا تھا۔ اُن کے عبرت ناک واقعات بیان کرکے اچھی طرح ظاہر فرما دیا کہ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا۔ علامہ ابن خلدون نے انھی قرآنی قصص سے فلسفہ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ اللہ تعالیٰ جب کبھی کسی واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اُس سے کسی خاص نتیجہ کی طرف توجہ دلانی مقصود ہوتی ہے یعنی ع سُنو احوال اگلوں کا سبق لو اور کرو عبرت۔

حقیقی حیات اور حقیقی علم

خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں اس کی حاجت تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک مکمل دستور العمل ہمارے پاس بھیجے۔ تاکہ اُسے ہم اپنا دلیل راہ ہدایت بنائیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنا کلام اپنے حبیب کی معرفت ہم تک بھیجا۔ اور اُس کلام ربانی کا نازل ہونا تھا کہ دنیا میں ہل چل مچ گئی۔ اور ایک انقلاب عظیم عالم میں پیدا ہوا۔ اب جو دُنیا بن سنور کر نکھری تو یہ وہ دنیا ہی نہ تھی۔ مگر افسوس ہے دنیا پر کہ اُس کا چہرہ پھر بدنما دھبوں سے داغدار ہوتا جاتا ہے۔ اُس دستور العمل سے معاصی ہمیں بہت کچھ دور ہٹا کر لے آئے ہیں ؎

سنبھلنے دے ذرا اے ناتوانی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

حضرات! یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ اور خوب یاد رکھیے کہ پوری متمدن زندگی اور صحیح و سچی حیات انسانی جبھی حاصل ہوگی جب کہ بارگاہ نبوت سے تعلیم حاصل کی جائے۔ اور اُس قدر علم کا حصہ

جس کی تعلیم مختص انبیا علیہم السلام کے ساتھ ہی اور جس تعلیم کے لیے اُن کی بعثت ہوتی ہی۔ اگر نہ حاصل کیا جائے تو اگرچہ دیگر علوم و فنون سے آپ مالا مال ہی کیوں نہو جائیں مگر حقیقت میں آپ مفلس ہی رہینگے۔ گو ظاہر میں آپ کی حیات انسانی معلوم ہوگی مگر حقیقت میں یہ اُس کا ڈھانچ و قالب بیجان ہوگا جو واقعہ میں بیکار و لاسود محض ہی۔ جس طرح جسم بلا روح مُردہ ہی اسی طرح تمام علوم بغیر تعلیم رسالت مردہ ہیں۔ ہمارے تمام علوم مدونہ ہمارے کسب کے نتائج ہیں۔ اس لیے اُن میں خطاؤں کا نہ صرف احتمال بلکہ وقوع ہوا کرتا ہی پھر ہمارے علوم میں یہ قوت کہاں کہ جس سے روح کا تغذیہ ہو۔ برخلاف اس کے پیغمبر کے علوم وحی الٰہی ہوتے ہیں۔ عصمت اُس کی ذاتی صفت ہوتی ہی۔ اُس کے علم میں نفس کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اُس کا علم اغلاط سے پاک اور نقص سے مُبرا ہوتا ہی۔ اسی لیے وہ سراپا رُشد و ہدایت ہوتا ہی۔ اسی امر کی طرف اس آیۂ کریمہ میں اشارہ ہی۔ هُوَ الَّذِیۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ وَ کَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیۡدًا۔ بعد اس کے کہ اس قدر بحث آپ رسالت کے متعلق سُن چکے اس بات کی طرف ذرا توجہ فرمائیے کہ وہ کونسی رہنمائی و ہدایت تھی جسے لیکر ہمارے پیغمبر روحی فداہ تشریف لائے۔ تاکہ لیظہرہ علی الدین کلہ اچھی طرح آپ سمجھ جائیں۔ اس کے لیے مختصر جملوں میں پہلے عرب کی حالت ایام جاہلیت کی سننا چاہیئے۔ اُس وقت اس ہدایت کے غلبہ و عظمت کا حال معلوم ہوگا۔

حالتِ عرب قبل بعثت اور اُس کا علاج

بعثت کے وقت عربوں کی حالت علمی یہ تھی کہ کل چھ یا سات آدمی مکہ میں ایسے تھے جو اسقدر لکھنا پڑھنا جانتے تھے جس سے کاروبار تجارت اُن کا سنبھلا رہے۔ اس لیے کہ نوشت و خواند اُن کے خیال میں شیوۂ اراذل تھا جنھیں نہ غیرت ہو، نہ شجاعت۔ تمدن و معاشرت کی اُن کے یہ حالت تھی کہ چمڑے کے خیمے اُن کے مکانات تھے۔ بکریوں اور اونٹ کے گلے اُن کی معیشت۔ جہاں سبزہ اور پانی دیکھا وہیں خیمہ نصب کر دیا۔ ایک موسم میں یہاں ہیں تو دوسرے موسم میں وہاں۔ سلطنت کی اُن میں یہ حالت تھی کہ نہ کوئی اُن کا باضابطہ بادشاہ تھا اور نہ اُن پر حکومت کرنے کے لیے کوئی قانون۔ قبائل کے شیوخ سردار ہوتے۔ کبھی کسی کی اگر جمعیت زیادہ ہوگئی اور دل خوش کن لقب سلطان کا اُس نے قوم سے حاصل کرلیا تو چندے روز میں کسی معمولی بات پر کوئی قبیلہ اُس سے اُلجھکر اُس کا اور اُس کے خاندان کا اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ اُس لقب و خطاب کا خاتمہ کر دیتا۔ قصائد و اشعار جاہلیت سے ان تمام باتوں کا کافی ثبوت ملتا ہی۔ اب ایسے حال میں جب کہ قوم میں

نہ سلطنت ہے نہ تمدن نہ علم نہ امن نہ اتفاق رسول مبعوث ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو ہر حال سے پست اور ہر پہلو سے ضعیف پاتا ہے۔ اُس کے گرد وپیش قیصر وکسریٰ کی سلطنتیں جہانداری وجہانبانی کا پھریرا اُڑا رہی ہیں۔ ایران کی نفاست پسندی اپنے معاشرتی نازو کرشمے کی بہاریں دکھلا رہی ہے۔ یونان وسکندریہ کا بحر فلسفہ موجیں مار رہا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پیغمبر قوم کو ان سب میں سے کس شے کی طرف بلاتا ہے۔ ایک ایسی قوم جو تمام کمالاتِ انسانی سے خالی وعاری ہوگئی ہو اور دوسری مقابل قومیں بعض کمالات اپنے آپ میں رکھتی ہوں رسول نے اُس وقت میں اپنی قوم کو کیا رہنمائی کی۔ آیا اُن سے یہ کہا کہ اے قوم اُٹھ تلوار و نیزوں کو سنبھال اور تو بھی ایک ملک گیر وجہاندار کی حیثیت مثل قیصر وکسریٰ کے اپنے میں پیدا کر۔ یا یہ کہا کہ اے قوم تھپڑ و نکے بھنے گوشت اور اونٹوں کے کوہان کا کباب کبتک یہ چپٹے کے خیمے میں رہنا کہاں تک بیدار ہو اور کم از کم ایران جیسی معاشرت تو اختیار کر۔ یا یہ کہا اے اہلِ عرب یہ جہالت سے اُنس اور علوم وفنون سے وحشت تابکے ہمت کرو اور رشک اسکندریہ ویونان مکہ کی وادیوں کو بنادو۔

دیکھئے قوم سرتاسر مریض ہے بیماریوں نے کوئی حصہ جسم کا چھوڑ نہیں رکھا ہے۔ اب اس وقت علاج کونسے مرض کا کیا جائے جس سے تمام بیماریاں خود بخود زائل ہوجائیں۔ آیا اُسے جہالت کے مرض سے علوم عقلیہ پڑھا کر شفا ہو۔ یا تمدن کی مفرحات دیجائیں یا سلطنت کا جواہر مہرہ اُسے استعمال کرایا جائے۔ غرض یہ کہ کیا کیا جائے جس سے یہ مریض نہ صرف صحیح وتندرست ہوجائے بلکہ دوسرے مریضوں کے لیے اُس کا وجود اکسیر اعظم بنجائے۔ تو اس کا صحیح جواب وسچا جواب وہی پہلی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوگی جو سب سے پہلے آپ نے اپنی قوم کو فرمائی۔ وہی حقیقی علاج تھا اُس قوم مریض کا اور وہی سچی شاہ راہ تھی ترقی کی اور وہی کلید تھی خزائن تمدن کی۔ کیا تم سے وہ اولین تعلیم مخفی ومجہول ہے۔ نہیں ہر گز نہیں۔ کہہ اُٹھو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ ۔ یہی تھا سرا پا مرض قوم کا علاج کہ اَیُّھَا النَّاس قولوا لا الٰہ الا اللّٰہ۔ جب قوم نے اپنا رشتہ خدا سے درست کرلیا تو پھر وہ تمام تعلقات جن کا علاقہ مخلوق یا کائنات کیساتھ تھا خود بخود سُلجھ گئے اللہ سے بُعد ایسا بدبخت مرض ہے کہ جس کے سبب سے انسان تمام بدنصیبیوں کا آج باج گاہ بنجاتا ہے۔ اور جب اس کا علاج کیا جاتا ہو تو اس بیماری کی دوا نفس کو تمام دواؤں سے زائد کڑوی و کسیلی معلوم ہوتی ہے۔ اور اس لیے نفس امارہ اس سے سخت ابا کرتا ہے۔ اس وقت میں بھی تم دیکھو گے کہ انسان کو علوم مدونہ حاصل کرنا آسان ہے معیشت کا سامان فراہم کرنا بھی سہل ہے۔ ان چیزوں کے حاصل کرنے کا خود بھی

ولولہ ہوتا ہی اور دوسروں کو بھی جوش میں لاسکتے ہیں۔ لیکن خدا کا خوف دل میں پیدا کرنا اور اُس کو حاضر و ناظر جانکر اپنے معاملات و اخلاق کو درست کرنا نہایت ہی کمیاب بلکہ نایاب ہی۔ پس رسولؐ نے اصلی مرض کی تشخیص کی اور اُس سے صحت یاب ہونے کے لیے ایک قدح توحید کا تیار کیا۔ قوم کڑوی و تلخ دوا دیکھکر بہت کچھ مچلی مُنہ موڑا ہاتھ پاؤں پھینکے لیکن پیغمبرؐ نے اللہ شافی اللہ کافی کہکر وہ پیالہ منھ سے قوم کے لگا ہی دیا۔ اب کیا تھا ؎

مستِ می بیدار گردد نیم شب ؂ شد
مستِ ساقی روزِ محشر بامداد

دوا کا حلق سے اُترنا تھا کہ صحت کے آثار نمودار ہوئے۔ ہر طرف سے رحمت کے دروازے کُھل پڑے۔ علوم و فنون کی باگ بھی مُسلمانوں کے ہاتھ میں آگئی اور سریر سلطنت پر بھی قبضہ ہوگیا۔

فتوحاتِ اسلامیہ اور علوم مدونہ عربیہ اس وقت تک اُن پاکبازوں کے کمالات و جاہ جلال کا نہایت بلند آہنگی سے اظہار کر رہی ہیں۔ وہ دنیا سے چل بسے لیکن اُن کی مہربانیاں اُن سے آیندہ آنیوالی نسلوں کے لیے ہمیشہ شکریہ ادا کراتی رہینگی ؎

ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اسلاف اور اخلاف

تم دیکھوگے کہ جب تک مسلمانوں نے اطاعت الٰہی کو اپنا شعار رکھا اور سرًا و علانیۃً خدا کے بھیجے ہوئے دستور العمل کو اپنا نصب العین بنائے رکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا نمونہ اُن کے پیش نظر رہا اُس وقت تک اُن کی ترقی برق رفتار رہی آج جس چیز کی بازار مسلمین میں کساد بازاری ہی قرون اولیٰ میں اُس کی ایسی فراوانی تھی کہ اپنے تو خیر اپنے ہی تھے بیگانوں تک کے گھروں کی رونق انھی مسلمانوں کے عطیات کا نتیجہ تھا۔ دیکھیئے آج یہ رونا ہے کہ مسلمان تمام اقوام سے تعلیم میں پیچھے ہیں اور اس قدر موخر اور اس قدر بطی السیر ہیں کہ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اُس قوم کے جوان کے دوش بدوش آباد ہی کب تک ہم سفر و ہم منزل ہونگے چہ جاے کہ اُن اقوام کے پہلو میں جگہ پانے کے قابل ہوں جو اس وقت سر بفلک ہیں۔ اور ذرا یہ دیکھو کہ مُسلمان جب کہ سچ مچ مُسلمان تھے تو کیا اسی طرح ان علوم دنیاوی سے بے نصیب تھے۔ اس کے لیے زائد مطالعہ

کی حاجت نہیں ایک سرسری نظر عہد مامون الرشید پر ڈالو۔ خود ہی معلوم ہو جائیگا۔ حدود اسلامیہ کی مامون کے دور سلطنت میں وسعت کو خیال کرو۔ تمھیں ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ملیگا۔ ایسے ایسے مدارس اعلیٰ و عظیم الشان تم پاؤ گے جن میں ہر ایک اپنی ذات سے ایک یونیورسٹی کا حکم رکھتا ہوگا۔ بغداد کا چپہ چپہ تمھیں سائنس کا مرکز معلوم ہوگا۔ اس عہد میں کتنے علوم ایجاد ہو چکے تھے اور کتنے فنون میں کتابیں تصنیف ہو چکی تھیں۔ تاتاریوں کے حملے اور بغداد کی تباہی کے بعد بھی اگر اُن کی فہرست تیار کی جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب کی شکل میں مرتب ہو سکتی ہے۔ اس عہد میں علم کیمیا کے متعلق مسلمانوں نے تقطیر (عرق کھینچنا) تصعید (بخار منجمد کر کے اوڑانا) تسئیح (پگھلانا) ترویق (چھاننا) وغیرہ وغیرہ ایجاد کر لیا تھا۔ زمین کی پیمائش ہو چکی تھی۔ مناظر و مرایا۔ جر ثقیل و توازن مائعات پر عجیب و دلکش تحقیقات ہوئی تھی۔ غرض قطع نظر اُن علوم کے جن کا تعلق براہ راست مذہب سے تھا یا جو مذہبی علوم کے خدام و وسائط تھے تم اُن علموں میں جنھیں عقلیہ کہا جاتا ہے مسلمانوں کا ایسا بلند منصب پاؤ گے کہ اس وقت تمھیں حیرت ہوگی کہ کیا یہ وہی قوم ہے جو کسیوقت تمام دنیا میں سب کی استاد تھی اور آج شاگردی کے قابل بھی نہ رہی۔ اس عہد کے عام مذاق کا اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ہر رئیس اپنے مکان کی زینت کتب خانہ کو اور اپنی مجلس کی رونق مذاکرہ علمیہ کو سمجھتا تھا۔ امرا کی جماعت عموماً ناؤنوش و فضول و لایعنی باتوں میں اوقات صرف کیا کرتی ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں علم کی ہمہ گیری سے وہ بھی نہ بچ سکے۔ علمی کتابوں کا ہونا دقیق مسائل پر مباحثہ قائم کرنا اور خود بحث میں محققانہ حصہ لینا لوازمات امارت سے تھا۔ گلی کوچوں میں سے بھی اگر کوئی گزر جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ سیکھ ہی لیتا ہے۔ یہی حال صنعت و حرفت و تجارت کا تھا۔ ہر شخص اپنا کسب کرتا اور اپنی روٹی اپنے دست و بازو سے حاصل کرتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ نصیحت کہ "اَلسُّوَالُ ذِلٌّ" (مانگنا خواری ہے) ہر شخص کو یاد تھا۔ اور اس پر خلق اس شدت سے معمل تھی کہ اگر کسی کا کوڑا زمین پر گر جاتا تو سوار خود گھوڑے سے اتر کر اُسے اُٹھاتا تھا۔ کسی دوسرے سے اٹھانے کو کہنا داخل سوال سمجھا جاتا تھا۔ مجھے اس پر ایک واقعہ عہد رسالت کا یاد آیا۔ ایک مفلس شخص دربار رسالت میں حاضر خور و نوش کے لیے سوال کرتا ہے۔ آپ اُس سے فرماتے ہیں کہ تیرے گھر میں کوئی سامان ہے جواب نفی میں ہوتا ہے۔ دوبارہ فرماتے ہیں کہ کچھ تو ہوگا۔ غور کر۔ غرض بہت فکر و خوض کے بعد اُس نے سوچکر عرض کیا کہ ہاں ایک فرسودہ پالان رکھا ہوا ہے آپنے فرمایا کہ اُسے لے آ۔ جب اُس نے سامنے لا کر حاضر کر دیا تو آپنے اصحاب سے فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس محتاج کے کہنہ و فرسودہ پالان کو خریدے۔ ایک صحابی نے

دو درہم قیمت دیکر اُسے خرید لیا۔ آپ نے ایک درہم اُسے دیکر فرمایا کہ جا بازار سے ایک کلہاڑی خرید لا۔ جب وہ کلہاڑی لے آیا تو آپ نے اپنے دستِ مبارک سے اُس میں لکڑی کا ایک بینٹ لگا دیا، اور اُس سے کہا کہ ایک درہم جو بچا ہوا ہے وہ اپنی بی بی کو جا کر دے تاکہ آج کے کھانے کا وہ اس سے سامان کرے اور تو کلہاڑی لیکر جنگل جا، اور لکڑیاں لاکر بازار میں فروخت کر، اس طرح اپنی روزی اپنے قوّت بازو سے پیدا کیا کر۔ خیال کرنا چاہیئے کہ اسلام نے کہاں تک ہمیں باغیرت اور کہاں تک کاروباری بنانا چاہا تھا، مگر ہم نے اپنے آپ کو کیا بنا ڈالا۔ افسوس تباہی خود ہم اپنے اوپر لائیں اور اتہام اسلام پر رکھیں۔

اب جب کہ مسلمان اپنے اُس دستور العمل سے، جو خدا نے اُن کے صلاحِ معاش و معاد کے لیے بھیجا تھا، ہٹنے لگے تو سب خرابی آہستہ آہستہ اُن میں آنے لگی۔ زبردست زیردستوں پر ظلم کرتا، ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ نہ کرتا، اس سے فساد و نااتفاقی پیدا ہوئی، امنِ عامہ میں خلل واقع ہوا جس سے علم و صنعت کی سرد بازاری ہونی شروع ہو گئی۔ اسی طرح ایک ایک نصیحت پر عمل چھوٹتا گیا اور نتیجۃً خرابیاں آتی گئیں۔ اب نہ علم ہے نہ تجارت، نہ صنعت ہے نہ زراعت، ہائے ہائے کیا کرو یا اسلاف کے کارنامہ پڑھکر فخر و مباہات کرتے رہو، اس سے کیا ہوتا ہے۔

عزیزو! جس طرح کل گزشتہ کا کھانا آج کی بھوک کو دفع نہیں کر سکتا، اُسی طرح گزشتہ اقبال کا تذکرہ آج ہمیں اقبال مند نہیں بنا دے گا۔ جس طرح میّت پر نوحہ کرنے سے اُس کی مراجعت نہیں ہوتی اُسی طرح ہائے وائے کرنے سے وہ نعمتِ اسلامی واپس نہیں آتی ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسّر شدی وصال
صد سال می تواں بہ تمنّا گریستن

ہاں اُس چیز کو پھر حاصل کرو جس کے طفیل میں سب کچھ آگیا تھا بغیر اُس کے ترقی محال ہے اور یہ استحالہ کا حکم میں نہیں دے رہا ہوں بلکہ قرآن کریم کا یہ فتویٰ ہے! اور یہ وہ فتوے ہے جس کا مشاہدہ تم ہر روز ہر شخص میں کیا کرتے ہو۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ اُن جذبات کو جو ہمارے نفوس میں ودیعت کیئے گئے ہیں جب تک ہم صحیح راہ اعتدال پر نہ لائیں گے، ہرگز ترقی کا منھ دیکھنا نصیب نہو گا۔

اصول ترقی اور قرآن کریم

آؤ ہم اپنے ترقی کے اصول قرآن کریم سے دریافت کریں جو وہ بتائے اُسی راہ پر چلنے کی کوشش کریں اگر اس سعی کا نتیجہ اس قدر بھی ہو کہ ہم اپنی موجودہ حالت سے انحطاط نہ کریں اور روز افزوں پستی سے نجات پا جائیں تو شاید اُس وقت آگے بڑھنا بھی آسان ہو جائیگا! اس وقت تو ہر لمحہ ہمیں فنا کے سیل میں بہائے لئے جا رہا ہے ؎

گرے جاتے ہیں اپنے آپ نظروں سے ستم یہ ہے
بدل جاتے تو کچھ رہتے۔ مٹے جاتے ہیں غم یہ ہے

قرآن کریم ہمیں یہ راز اس طرح بتلاتا ہے کہ اگر ہم اپنی اس نسبت کو جو ہمیں اپنے خالق سے ہونی چاہئے اور اُس تصرف کو جو ہمیں کائنات پر اللہ کی جانب سے عطا ہوا ہے صحیح طور پر درست کرلیں تو پھر وہی ہم ہیں اور وہی اقبال اس کے لئے (اوّلاً) ہمیں اپنی استعداد (ثانیاً) اپنا جائز تصرف معلوم ہونا چاہئے۔ ان میں سے ہر ایک کو قرآن کریم سے سنئے شاید اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق عطا فرمائے۔

کلام اللہ میں عزّ مجدہ نے ہماری استعداد سے اس طرح ہمیں آگاہ فرمایا ہے کہ اے انسان تیری ساخت سب سے بہتر میں نے بنائی ہے! اب اگر تو اپنے آپ کو خراب کریگا تو اس کا تو خود ذمہ دار ہے اور اگر میری بتلائی راہ پر زندگی بسر کریگا تو تیرے اجر کا سلسلہ غیر متناہی ہوگا۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ اس سے یہ تو قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ اگر ایمان و عمل صالح ہے تو پھر اجر کا سلسلہ غیر متناہی ہے اور اگر یہ نہیں تو پھر خوبی و کمال کا تو ذکر ہی کیا۔ اپنی اصل خلقت پر بھی قیام ناممکن ہے، اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ہی میں جا کر ٹھہرینگے۔ غرض ہم میں ایسی قابلیت و استعداد ہے کہ ہم اپنے آپ کو جیسا چاہیں ویسا بنا سکتے ہیں۔ استعداد انسان کے متعلق اسی قدر پر کفایت کیجئے۔

انسان اور کائنات عالم کے تعلقات

اب اپنے اس تصرف و تعلق کو دیکھئے جو انسان کا کائنات کے ساتھ ہے۔ اس تعلق کے جاننے کے بعد ایک عجیب پُر فضا کامیابی کا میدان سامنے آجاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہمارے سوا جس قدر مخلوق ہیں خواہ وہ جماد یا نبات یا حیوان ہوں، خواہ کائنات الجو کے موجودات ہوں مثل سحاب و باراں وغیرہ، خواہ عالم علوی کی چیزیں ہوں مثل آفتاب، ماہتاب، زہرہ و مشتری وغیرہ سب کے سب ہماری خادم ہیں اور ہم مخدوم۔ ہر ایک سے ہماری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور ہر ایک سے ہم اپنا کام لیتے ہیں اور کام بھی اس طرح ہم ان سے لیتے ہیں کہ ان اشیا کو کسی وقت اپنی خدمت کے عوض کا نہ تو کسی طرح

خیال ہوتا ہے اور نہ ہم بالعوض اُن کے کام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اور نہ کر سکتے ہیں گویا کہ ہم سراپا مخدوم ہی مخدوم ہیں۔ صرف اُن کا استعمال میں لانا، اُن سے فائدہ حاصل کرنا ہی اُن کی خدمت ہے۔ قرآن شریف ہمارے اسی تعلق کو یوں بیان کرتا ہے اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً پھر دوسری جگہ فرماتا ہے وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ان آیات سے کرامت وخلافت انسان کی مسلم ہو چکی۔ اب آگے بڑھئے ارشاد فرماتا ہے سَخَّرَ لَکُمُ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ یعنی اللہ کے حکم سے ستارے، چاند، آفتاب، دن رات، سب تمہارے مسخر ہیں۔ پھر فرماتا ہے سَخَّرَ لَکُمُ الْبَرَّ وَالْبَحْرَ دریا و زمین خشکی و تری، تمہارے مسخر کر دیئے۔ ان دونوں آیات سے معلوم ہوا کہ عالم علوی تک کی پر شوکت چیزیں انسان کی مسخر ہیں، خود وہ زمین جس پر انسان آباد ہے اور سمندر جو دنیا کو گھیرے ہوئے ہے یہ بھی انسان کے مسخر ہیں، ان چیزوں میں انسان اگر تصرف کرے تو اُس کا پورا حق ہے، لیکن زمین پر نباتات و حیوان بھی ہیں شاید ان پر دست درازی و انتفاع کا دعویٰ غلط ہو اور یہ خود متصرف ہونے کی حیثیت رکھتے ہوں۔ آیئے اس کا فیصلہ بھی کلام اللہ سے کرلیں۔ اولم یروا انا نسوق الماء الی الارض الجرز فنخرج بہ زرعًا تاکل منہ انعامھم وانفسھم افلا یبصرون، ہم اُفتادہ زمین پر پانی بہاتے ہیں اُس سے زراعتیں پیدا ہوتی ہیں کچھ تو خود کھاتے ہو اور کچھ تمہارے جانوروں کے چارے ہوتے ہیں، کیا میرے اس کرم کو نہیں دیکھتے اس سے یہ معلوم ہوا کہ زمین جو کچھ اُگاتی ہے وہ سب ہمارے ہی لئے ہے، بعض کو ہم خود کھاتے ہیں اور کچھ حصے کو اپنے جانوروں کا چارہ بناتے ہیں۔ اب رہے حیوان، ان کا بھی فیصلہ کر لیجئے والانعام خلقنا لکم فیھا دفء ومنافع ومنھا تاکلون ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون وتحمل اثقالکم الی بلد لم تکونوا بالغیہ الا بشق الانفس ان ربکم لرءوف الرحیم والخیل والبغال والحمیر لترکبوھا وزینة ویخلق ما لا تعلمون خلاصہ مختصر ترجمہ اس کا یہ ہے کہ چارپائے میں نے تمہارے لئے پیدا کئے ہیں، اُن سے گوناگوں نفع حاصل کرتے ہو، جاڑے کا سامان اُن کے اُون سے بناتے ہو بعض کو اُن میں سے کھاتے ہو، صبح کو وہ چراگاہ کو جاتے ہیں یا شام کو جب واپس آتے ہیں تو اُن میں ایک قسم کا جمال دیکھتے ہو تمہارے بوجھ کو ایک شہر سے اٹھا کر دوسرے شہر پہونچاتے ہیں جس کا لیجانا تم پر شاق ہوتا! گھوڑے، خچر، گدھے، تمہارے سواری کے لئے پیدا کئے، اور بہت چیزیں تمہارے لئے اللہ پیدا کر رہا ہے جسے تم نہیں جانتے۔

ہماری مخدومیت کی غایت

اب تو ہر طرح اطمینان ہو گیا کہ یہ تمام چیزیں ہمارے ہی لئے ہیں یہ سب

خدام ہیں اور ہم مخدوم لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ ہم صرف مخدوم ہی کیوں رہے۔ سلسلہ تو یوں ہے کہ جماد نبات کے کام آتا ہے اور نبات جماد کے کام تو نہیں آتا لیکن حیوان کے کام آتا ہے۔ اسی طرح حیوان نبات کے لئے کچھ مفید نہیں لیکن انسان کا مسخر و غلام ہے توجبکہ یہ سلسلہ مخلوق میں پایا جاتا ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ کا خادم اور وہ اپنے سے بلند تر کا خادم تو پھر اس کی کیا وجہ کہ باوجود مخلوق و حادث و ممکن ہونے کے ہم کسی کے خادم نہ ہوں۔ تھوڑے غور سے یہ معلوم حاصل ہوا جاتا ہے کہ تمام مخلوق سے چونکہ انسان اعلیٰ و بالا قرار پایا ہے ہر چیزیں اس کی مسخر کر دی گئی ہیں تو پھر اسے مخلوق کا خدمت گذار نہ ہونا چاہئیے! بلکہ یہ تو خالق کا غلامی کرنے والا اور اسی کا عبادت گذار ہے اور صرف اسی غلامی نے اسے یہ مرتبہ دیا ہے کہ جس کے باعث یہ سب مخلوق پر حاکم ہے اسی امر کی طرف سعدیؒ نے اشارہ کیا ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار
شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نہ بری

اب ذرا اس طرف متوجہ ہوجئے کہ جب آفتاب و ماہتاب نجوم و زمین و دریا وغیرہ وغیرہ سب ہمارے مسخر کر دیئے گئے تو اب ضرور ہوا کہ ہمیں اپنے تابعداروں سے کام لینے کا سلیقہ بھی ہونا چاہیئے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ کس سے کونسا کام لینا ہے جس قدر ہمیں ان سے کام لینا کا طریقہ و علم زیادہ ہوتا جائیگا اسی مناسبت سے ہم اپنی حکومت میں کامل سمجھے جائینگے اور ہماری یہ حکومت اور ان تابعداروں سے خدمت لینا عین مرضی الٰہی کے مطابق ہوگا۔

تمدن و سائینس اور قرآن مجید

پس اے عزیزو! کیا تمدن کی روح اس کے سوا کوئی اور چیز ہے؟ کیا سائینس الٰہی اس امر کو منکشف نہیں کرتا کہ کس چیز کو ہم کس طرح اپنے کام میں لائیں؟ اگر یہی بات ہے اور ضرور یہی ہے تو میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ تمدن و سائینس کی سنگ بنیاد قرآن کریم کی ہی تعلیمات ہیں۔ سائینس پڑھنا، اس میں کمال پیدا کرنا حقیقت میں مسخرہ مخلوق سے مستفید ہونا ہے اور ان کے مسخر ہونے کو بامعنی بنانا ہے۔ کوئی وجہ اس کی نہیں کہ قرآن ہمیں جن امور کی طرف رہنمائی کرے جن سے بہرہ مند ہونے کی ترغیب دلائے ہم اسے مذہب کے خلاف سمجھیں پھر تو کھانا پینا، پہننا، رہنا سب ہی دشوار ہو جائیگا۔ رہی یہ بات کہ کونسی زبان میں ان علوم کو پڑھیں؟ اس تنگ وقت میں زیادہ بحث کا تو موقع نہیں لیکن اس قدر سمجھ لیجئے کہ اردو، فارسی، پنجابی، پشتو، بنگلہ وغیرہ وغیرہ تو جائز ہوں مگر یورپ کی زبان حرام

آخر اس کی وجہ؟ اگر آج تمام یورپ یا کوئی اس کا حصہ دائرۂ اسلام میں آجائے تو کیا اُسے اپنی مادری زبان کا بولنا یا اُس میں پڑھنا حرام ہو جائیگا؟ کیوں خدا کی رحمت کو اس قدر تنگ کیا جائے؟ اور ترجیح بلا مرجح دیجاوے؟

الحکمۃ ضالۃ المؤمن حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ اپنی چیز جہاں کہیں ملجائے اُسے فوراً اٹھا لو۔

سخن کز بہر حق گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکان کز بہر او جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا

حضرات! کوئی وجہ اس کی نہیں کہ تعلیمات قرآنی سائنس کے سامنے سپر ڈال دیں، اور سائنس جاننے والا قرآنِ مجید کو (نعوذ باللہ) سبکی کی نگاہ سے دیکھے یا اُس کے فہم و تلاوت سے اپنے کو مستغنی سمجھے۔ اس لئے کہ سائنس کی بحث مادّہ و متعلقاتِ مادّہ تک محدود ہے۔ حیاتِ دنیا کو بارونق بنانا، لوازمات حیوانی کے لئے سامان فراہم کرنا اس کی غایت ہے لیکن قرآن کی تعلیم مادّیات سے بہرہ مند ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے جذبات کو معتدل، افعال قلوب کو مزین بناتی ہے اس سے پھر آگے بڑھکر تربیت روح کی کرتی ہے معاد کی حیات کو آراستہ کرتی ہے اس مقام پر تو سائنس کے پر جلتے ہیں، سائنس غریب کو تو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔

قابل گریہ نظارہ اس بات کو خوب یاد رکھو کہ سائنس نے توحید والوہیت نبوت و رسالت وحی والہام وغیرہ سے کبھی بحث نہیں کی، چہ جائیکہ سائنس نے ان باتوں کا انکار کیا ہو۔ اگر کوئی ایسا کہتا ہے تو یقین جانو کہ اُس نے سائنس کو قطعاً نہیں سمجھا۔ یہ اُس پر افترا رکھتا ہے بہتان رکھتا ہے، سائنس اُس سے بیزار ہے اور اس بیجا حمایت سے فریادی ہے تم بھی ایسے شخص کی باتوں سے منھ پھیر لو اور اس کے لئے دعائے ہدایت کرو۔

دوستو! کیا یہ بے انصافی نہ ہوگی کہ ہم اپنے مطیعوں سے تو کام لیں کائنات سے بہرہ مند ہوتے رہیں؛ لیکن جس کی اطاعت کے لئے ہم پیدا کئے گئے ہیں اُس کی طرف بھول کر بھی توجہ نہ کریں؛ بلکہ اُسے ایک لایعنی امر سمجھیں، یہ کیسی بے انصافی و صریح ہٹ دھرمی ہے۔ اگر یہ پہلو ہماری زندگی کا تاریک رہا تو ہم کمال انسانی کے عرفان سے قاصر رہے اور سخت بازپرس منعم حقیقی کی اپنے اوپر عاید کرلی، بغیر اطاعت الٰہی و عبادت معبود جو زندگی بسر ہوئی وہ حیوانی حیات سے ایک انچ بھی بڑھ نہ سکی۔ افسوس کہ اس زمانہ میں عبادت کی لذت سمجھانا نہایت ہی دشوار و اہم ہوگیا۔ تواریخ سے یہ پتا چلتا ہے کہ جب دنیا میں علوم عقلیہ کے ساتھ لوگوں نے

حد سے زائد غلو پیدا کیا تو وہ عبادت سے غافل و متہاون ہو گئے لیکن اس دورایام کو کیا کہئے کہ ایک طرف تو جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے، دوسری طرف تدین سے دامانِ عمل خالی ہے۔ عامۂ مسلمین کی حالت کا اندازہ کر جاؤ تو خود معلوم ہو جائے گا کہ ہم راہِ مستقیم سے کس قدر منحرف ہو گئے ہیں: مساجد ہیں لیکن نمازی نہیں قرآن کی جلدیں متعدد موجود ہیں مگر تلاوت نصیب نہیں۔ تجوید و عربی لحن سے قرآن پڑھنا آتا ہے لیکن اس پر عمل کی توفیق نہیں۔ عبادتیں ویران، معاملات تباہ، تعلقات پراگندہ، اخلاق ردی پھر کیا امید بھلائی کی ہے۔

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا

اصلاح قوم کے لئے کوئی تجارت کی رغبت دلاتا ہے کوئی علوم مغربی کے سحر آفریں فضائل سناتا ہے کوئی علوم مشرقی کی ہدایت کرتا ہے کوئی صنعت و حرفت کی طرف مائل کرتا ہے؛ لیکن خدا تو یہ فرماتا ہے کہ تم میرے مطیع ہو جاؤ پھر سب چیزیں تمہاری تابع فرمان ہو جائینگی ؎

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

تم اللہ کے ہو جاؤ، تمام چیزیں تمہاری ہو جائینگی۔ تم اللہ سے پھر جاؤ گے تمام نعمتیں تم سے منہ موڑ لینگی ؎

چوں از دگشتی ہمہ چیز از تو گشت
چوں ازو گشتی ہمہ چیز از تو گشت

ہماری اخلاقی حالت اس درجہ بدتر ہو گئی ہے کہ عیب کو ہم ہنر سمجھنے لگے اور تلمیع کو کمالِ دانشمندی۔ یہ وقت اس کے بیان کرنے کا نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماوے وہ کلام مجید کی تلاوت باترجمہ کر جاوے، اور اس میزان پر اپنے آپ کو تول لے کہ کہاں تک صدق و حق کا پلہ وزنی ہے، اور کہاں تک تزویر و ریا کا۔ اخلاقِ حسنہ کہاں تک پائے جاتے ہیں اور کس حد تک اُسے اپنے جذبات پر قدرت ہے، کس مرتبے تک حقوق العباد کے ادا کرنے میں وہ سرگرم ہے۔ میں اس وقت دو واقعے آپ کے سامنے گزارش کرونگا جس سے آپ اس امر کا فیصلہ کر سکینگے کہ اخلاق کی قوت کس درجہ ہے۔

معیار صداقت نبوت

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جبکہ ہرقل قیصر روم کے پاس اپنا قاصد بھیجا ہے تو اس نے عربوں کی اس جماعت کو جو اس کے ملک میں تاجرانہ حیثیت سے گئے ہوئے تھے، تحقیق حال کے لئے طلب کیا۔ اب تم ذرا اس کو دیکھو کہ وہ کیا پوچھتا ہے اور ہر سوال کے جواب سے

وہ کیا نتیجہ نکالتا ہے۔ میں یہاں پر حدیث کا وہ حصہ جو سوال و جواب ہے پورا پڑھکر سناؤنگا تاکہ آپ کو کامل لطف حاصل ہو اور صحیح فیصلہ کرسکیں۔ اُس کے دس سوال ہیں نمبروار سنتے جائیے۔

(۱) کیف نسبہ فیکم اُن کا نسب تم میں کیسا ہے؟ قلت ھُوَ فینا ذو نسب مجیب کہتا ہے "وہ ہم میں شریف النسب ہے" ہرقل اس جواب کو سُنکر کہتا ہے کذالک الرسل تبعث الی النسب قومھا ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ قوم میں پیغمبر شریف ترین نسب کا ہوتا آیا ہے۔

(۲)

ھل قال ھذا القول منکم احد قط قبلہ۔ ان سے پیشتر دعوئ نبوت عرب کی سرزمین میں کسی اور نے بھی کیا تھا؟ جواب قلت لا۔ میں نے کہا نہیں۔ ہرقل کہتا ہے فقلت لوکان احد قال ھذا القول قبلہ لقلت رجل یاتسی بقول قیل قبلہ۔ تمہارا جواب نفی میں سُنکر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر تم ہاں کہتے، تو میں کہتا کہ یہ شخص ایک ایسا آدمی ہے جو اپنے سے پہلے کہی ہوئی بات کی ریس کرتا ہے۔

(۳)

ھل کان من آبائہ من ملک۔ آباؤ اجداد میں اُس کے کوئی بادشاہ گذرا ہے؟ فقلت لا میں نے کہا نہیں" ہرقل کہتا ہے قلت لوکان من آبائہ من ملک قلت رجل یطلب ملک ابیہ میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر آبا و اجداد میں اس کے کوئی بادشاہ گذرا ہوتا، تو میں کہتا کہ یہ ایک ایسا شخص ہے جو باپ کا ملک اسی حیلہ سے طلب کرتا ہے۔

(۴)

فاشراف النّاس اتبعوہ ام ضعفاء ھم قوم کے صنادید اُس کی پیروی کرتے ہیں یا ناتوان اشخاص۔ فقلت بل ضعفاء ھم میں نے کہا بلکہ ناتوان اُس کے دین کو لبیک کہتے ہیں۔ ہرقل کہتا ہے ھم اتباع الرسل رسولوں کی پیروہی جماعت ہوتی چلی آئی ہے۔

(۵)

ایزیدون ام ینقصون۔ یوماً فیوماً بڑھتے جاتے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں قلت بل یزیدون میں نے کہا وہ ہر روز بڑھتے جاتے ہیں، ہرقل کہتا ہے کذالک امر الایمان حتیٰ یتم ایمان کی یہی شان ہے یہاں تک کہ تمام ہو جاوے۔

(۶)

هل یرتد احد منهم سخطة لدینه بعد ان یدخل فیه اُس دین میں داخل ہوکر کوئی اس سبب سے مرتد بھی ہوجاتا ہے کہ اُس دین میں نفرت انگیز باتیں تھیں۔ فقلت لا۔ میں نے کہا "نہیں" ہرقل کہتا ہے۔ کذالك الایمان حین تخالط بشاشتہ القلوب ایمان ایسا ہی لطیف و لذیذ ہے کہ دل کو اس سے فرحت و انبساط ملتا ہے۔

(۷)

هل کنتم تتهمونه بالکذب قبل ان یقول ما قال دعوائے نبوت سے قبل تم نے اُسے جھوٹ بولنے سے بھی متہم کیا ہے؟ فقلت لا۔ میں نے کہا "نہیں" ہرقل کہتا ہے۔ فقد اعرف انه لم یکن لیذر الکذب علی الناس ویکذب علی الله میں نے جان لیا کہ جس نے انسان پر جھوٹ نہیں رکھا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ رکھیگا کہ اللہ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

(۸)

فهل یغدر۔ دھوکا، فریب، یا نقض عہد کرتے ہیں؟ فقلت لا میں نے کہا "نہیں" ہرقل کہتا ہے۔ کذالك الرسل لا یغدر رسول کی شان یہی ہے کہ وہ غدر نہ کرے۔

(۹)

هل قاتلتموه۔ تم سے اُنسے کبھی لڑائی ہوئی؟ فقلت نعم میں نے کہا "ہاں ہوئی" ہرقل کہتا ہے فکیف کان قتالکم ایاه اُن کے ساتھ تمھاری لڑائی کا کیا حال رہا؟ قلت الحرب بیننا وبینه سجال ینال منا وننال منه ہم میں اور اس میں لڑائی مثل ایک ڈول کے ہے، کبھی ہم نے کھینچ لیا اور کبھی اس نے۔

(۱۰)

ماذا یامرکم۔ تمھیں کیا حکم دیتے ہیں؟ قلت یقول اعبدوا الله ولا تشرکوا به شیئاً واترکوا ما یقول آباءکم ویامرنا بالصلوٰۃ والصدق والعفاف والصلة میں نے کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھراؤ، اور تمھارے آبا و اجداد جو کہا کرتے تھے اُسے چھوڑ دو اور ہمیں حکم کرتے ہیں کہ ہم نماز پڑھیں، سچ بولیں، پارسائی اختیار کریں، اقربا سے صلۂ رحم کریں۔

یہ ہیں وہ دس سوالات جو ہرقل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں کئے حضرت سفیان بن حرب اس کے راوی ہیں، انھیں سے خطاب تھا، اور انھیں سے کلام، باقی جماعت خاموش تھی، حضرت سفیانؓ اس وقت تک دولت اسلام سے مشرف نہیں ہوئے تھے، بعد فتح مکہ میں ایمان لائے ہیں۔ اب جبکہ سوال وجواب ختم ہو چکے اور ہر جواب پر ہرقل نے اپنی رائے کا بھی اظہار کر دیا تو سب سے آخر میں تعلیماتِ محمدی کو پوچھتا ہے جو اس کا دسواں سوال ہے اور اس کا جواب پا کر یہ کہتا ہے:۔

ان کان ما تقول حقا فسیملك موضع قدمی ھاتین وقد کنت اعلم انه خارج ولم اکن اظن انه منکم فلو انی اعلم انی اخلص الیه لتجشمت لقاءہ ولو کنت عندہ لغسلت عن قدمیه۔ یعنی یہ باتیں جو تم نے بیان کی ہیں، اگر سچ ہیں تو عنقریب وہ شخص اس جگہ کا مالک ہو جائیگا جو میرے قدموں کے نیچے ہے۔ میں نبی آخر الزمان کی بعثت کو تو جانتا تھا کہ ہونے والی ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ تم اہل عرب میں پیدا ہونگے۔ بہرحال اگر مجھے ان کے پاس تک پہونچنے کی امید ہوتی تو میں ان کی زیارت کے لئے ضرور مصائب سفر برداشت کرتا اور اگر میں ان کے پاس ہوتا تو ان کے قدم دھوتا۔

ایک غور طلب مسئلہ

فکر صحیح کیجئے ہرقل نے نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم وفن سے سوال کیا، نہ آپ کے خزینہ ودولت کو پوچھا نہ لشکر وسپاہ سے استفسار کیا اور پھر کس سہولت سے فیصلہ کر دیا کہ بہت جلد وہ شخص قیصر کی سلطنت کا مالک ہو جائیگا۔ کس طرح اس کے دل نے عظمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کر کے عقیدت کا اظہار زبان سے کر دیا۔ اس نے اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ جو ذات ان اخلاق سے متصف ہو اور جس کی تعلیمات ایسی زبردست ہوں اس کے لئے ہر طرح کی کامیابی حتمی ویقینی ہے۔

ایک اور واقعہ

اب دوسرا واقعہ سنئے:۔ سب سے پہلے غار حرا میں جب آپ پر وحی نازل ہوئی تو آپ نے مکان پر تشریف لا کر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا لقد خشیت علی نفسی مجھے اپنے جان کا خوف ہے اس وقت مجھے وحی کے معنی سمجھانے نہیں ہیں، مجھے تو اس کے ایک حصہ سے سند لانی ہے اور وہ حضرت خدیجہؓ کا جواب ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانے پر آپ نے دیا ہے:۔ قالت خدیجة کلا واللہ ما یخزیك اللہ ابدا انك لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق۔ حضرت خدیجہؓ نے جواباً فرمایا، ہرگز نہیں

قسم اللہ کی اللہ تعالیٰ کبھی بھی آپ کو رسوا نہ کریگا آپ صلہ رحم فرماتے ہیں، اقربا کے حقوق ادا کرتے ہیں یتیم عاجز و درماندہ کی آپ غمخواری فرماتے ہیں اور لوگوں کو وہ چیزیں آپ عطا فرماتے ہیں جو سوا آپ کے کسی اور سے نہیں مل سکتی، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور لوگوں کی حوادثات حقہ پر مدد فرماتے ہیں۔"

اس حدیث کے ٹکڑے کو میں نے آپ کے سامنے صرف اس غرض سے پیش کیا ہے تاکہ آپ یہ دیکھیں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو کس قدر اذعان و اطمینان اس امر پر تھا کہ ایک ایسا شخص جس کی ذات میں یہ صفات پائے جاتے ہوں وہ ہرگز ہرگز ذلیل و رسوا نہیں ہوسکتا، یہ اعتقاد کیسا سچا و صحیح ہے۔ تم تمام ملک کی تاریخ پڑھکر بھی ایک ایسا شخص نہ بتلا سکو گے کہ جس میں عادات حسنہ صدق و راستی کے ساتھ پائے جاتے تھے اور وہ ذلیل و خوار رہا ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی شریر النفس ظالم نے ایسے شخص کو اپنے جفا و ستم کے راہ میں کانٹا تصور کیا ہو اور محض اپنے خبث باطنی سے اس پر مظالم کئے ہوں لیکن اس سے کیا ہوا؟ نہ تو ذرہ برابر اس کی عزت میں کمی آئی نہ اس کے اوصاف جمیلہ کا پایہ ہلکا ہوا، ہاں ظالم کی سیہ کاریوں میں ایک اور دھبہ البتہ بڑھ گیا۔

سنگِ بد گوہر اگر کاسۂ زریں شکند
قیمتِ سنگ نیفزاید و زر کم نہ شود

حضرات! یہ ہے وہ ہدایت جس کی تعلیم کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسول کی بعثت فرمائی یہ ہے وہ نور علم جس سے جہالت کی تاریکیاں مٹ جاتی ہیں، یہ ہیں وہ عادات جو انسان کو سچ مچ انسان بنا دیتی ہیں یہ ہے وہ دستور العمل جس سے ملک آباد اور دنیا بارونق پذیر ہوتی ہے جب تک اس علم سے حصہ نپاؤ گے انسانی زندگی نصیب نہ ہوگی۔

ہست اسلام سیرتِ نیکو
نہ ہمی جامہ و قدِ دلجو

جب علم کے پڑھنے سے خوفِ خدا پیدا نہو معاصی کی برائیاں معلوم نہوں جذبات پر قوت حاصل نہو۔ وہ تعلق جو خدا سے ہونا ضروری ہے پایا نہ جائے تو پھر اُسے علم حقیقی کیونکر کہا جائے گا۔ علم حقیقی تو وہی ہے جس کے پڑھنے سے خشیت ایزدی دل میں پیدا ہوتی ہے اور یہی کیفیت دل میں پیدا ہوکر عالم و معاصی کے درمیان بطور پردہ کے حائل ہو جاتی ہے! اور یہ اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک دربار رسالت سے لگاؤ نہ پیدا کر لیا جائے۔ جسقدر دل میں یہ لگن بڑھتی جائیگی اسی قدر عبادات صحیح اور معاملات درست ہونگے۔

ایک بہترین قانون معاش و معاد	معاش و معاد کی جمع کرنیوالی دین و دنیا کو مزین کرنیوالی

بجز تعلیم رسالت اور کوئی تعلیم روئے زمین پر پائی نہیں جاتی اس خاکدان عالم میں وہ شمع (جس کے انوار میں دین و دنیا کی حسنات دکھلائی دیں) وہ بجز شمع نبوت کوئی دوسری شمع نہیں ہے۔ یہ نہ صرف دعوی اور دل خوش کن باتیں ہیں بلکہ واقعات و حقائق ہیں۔ اسلام سے پیشتر اور اسلام کے مابعد بھی غیر مسلمین میں تم کو اس امر کے شواہد ملینگے کہ باوجود علم و فضل پھر بھی یا دنیا اُن پر سراپا چھاگئی یا دین کے سمجھنے میں ایسے اغلاط اُن سے ہوئے کہ جس سے دین ایک ہولناک اور ناممکن العمل ہوگیا۔ مثلاً بعضوں نے قوائے فطری کو معطل و بیکار کر دینا انتہائے کمال سمجھا۔ ایسی جماعت کو اصطلاح میں آنعہ کہتے ہیں ان میں سے کسی نے اپنا ہاتھ اتنے عرصہ دراز تک اُٹھائے رکھا کہ اُس میں جھکنے کی طاقت اور گرفت کی قوت باقی نہ رہی۔ کسی نے خاموشی اختیار کرلی اور نطق کو خلاف تقوٰے سمجھ کر چپ سادھ گئے۔ کسی نے طول قیام سے قدم کے اعصاب خشک کردیئے اور اس کو مجاہدہ و ریاضت سے تعبیر کیا۔ کسی نے رہبانیت کو پاکبازی سے موسوم کیا۔ کسی نے دشت و جبل کو اپنا مسکن بنایا۔ غرض اس طرح کے خیالات اُس جماعت کے ہوئے جنھوں نے دنیا میں آکر اور رہ کر یہاں کے جائز تمتع سے بھی بہرہ مند ہونا اتقا و تقدس کے منافی جانا۔ قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہٖ کو نظر انداز کر دیا یعنی ان سے یہ تو کہو کہ اللہ نے جو یہ اشیا کہ اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں اُنھیں حرام کس نے کردیا) اس جماعت کے برعکس اک دوسرا گروہ ہے جس نے بجز حیاۃ دنیا اور کچھ نہ جانا۔ بہتر سے بہتر مکان میں رہنا، عمدہ سے عمدہ غذا کھانا، خواہشات نفس بلا لحاظ جا و بیجا جس طرح ہوسکے پورا کرنا، دولت جس ذریعہ سے ممکن ہو سمیٹنا اپنی زندگی کا ثمرہ قرار دیا۔ اسے اصطلاح میں لذتیہ کہتے ہیں ان کے نزدیک انسانی زندگی بس تمتعات دنیا سے بہرہ مند ہونیکا نام ہے۔ لاتلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ سے غافل ہوگئے یعنی اللہ کی یاد سے اولاد و مال تمھیں غافل نہ کرنے پائے۔

اب اس افراط و تفریط کے مقابلہ میں اسلام کی تعلیمات کی طرف غور کرو حکم ہوتا ہے ولا تنس نصیبک من الدنیا (جو حصہ تیرا دنیا میں مقرر کردیا ہے اُسے نہ بھول) جائز وسائل و پاک ذرائع سے جس قدر ہوسکے وہ سب انسان کا حصہ ہے۔ اُسے حاصل کرنا چاہئے۔ لیکن کہیں ایسا نہو کہ اسی حصے کی طلب میں انسان اپنی عمر کا تمام زمانہ بسر کردے اس لئے یہ ارشاد ہوتا ہے ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانساھم انفسھم اولئک ھم الفاسقون (اُن لوگوں کی طرح نہو جانا جنھوں نے خدا کو فراموش کردیا۔ پھر اللہ نے بھی اپنی رحمت سے انھیں بھلادیا اور خدا کا بھولجانا تو نافرمانوں کا شیوہ ہے) دیکھئے اصلاح معاش و فلاح معاد کے لئے

کے لئے کیسے زرّیں اصول بتا دیئے گئے۔ تمام دن و رات اپنا کاروبار محنت و راحت کیا کرو۔ لیکن جب نماز کا وقت آجائے تو چوبیس گھنٹے میں سے تھوڑا تھوڑا وقت یاد اللہ میں بھی صرف کیا کرو جن کی دی ہوئی نعمت کھاتے ہو جس کے عطا کردہ قویٰ سے کام لیتے ہو اُس کی بھی تو شکر گزاری چاہیئے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی کا صدقہ ہے کہ دین و دنیا دونوں ہمیں نصیب ہوئے۔ مرج البحرین یلتقیان بینھما برزخ لا یبغیان تعلیمات محمدی کا ایسا برزخ بیچ میں حائل ہے جس کی وجہ سے دنیا ہمارے دین کو تباہ نہیں کر سکتی نہ دینداری ہمیں دنیا میں بہرہ مند ہونے سے مانع آسکتی ہے ان باتوں کو سوچو غور کرو تو تمھیں اپنے مذہب کی قدر معلوم ہوگی پھر تمھیں اس سے تغافل کرنے پر ندامت ہوگی جس کا نتیجہ تمھارے لئے فرحت بخش ہوگا۔ حدود دائرہ میں رہ کر جس قدر دنیا کی نعمتیں حاصل کر سکتے ہو۔ اطمینان سے کرو۔ اطاعت و عبادت کے ساتھ جس قدر چین و آرام تمھیں مل سکتا ہو اُس سے ہرگز محروم نہ رہو۔ یہ کوئی اتقا و پرہیز گاری نہیں ہے بلکہ مکر و فریب ہے۔ اسی طرح یہ نفس کا دھوکا ہے جس نے تمھیں اہل زمانہ کی کورانہ تقلید کو آراستہ و پیراستہ کرکے ایک دلفریب شکل میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ جسے تم کبھی علم کی شان سمجھتے ہو اور کبھی شرافت انسانی اُس کا نام رکھتے ہو اور کبھی حیات اجتہادی و حریت سے اُسے موسوم کرتے ہو اور کبھی روشن دماغی و وسیع الخیالی اُس کا عنوان قائم کرتے ہو۔ ایک مرتبہ سچے دل سے لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھکر اپنے اصلاح کی طرف جھک پڑو ہدایت خداوندی تمھیں لبیک کہتی ہوئی خود اپنے آغوش میں لے لیگی اُس وقت تمھیں حقیقی شرافت و سچی حریت نصیب ہوگی بسم اللہ پڑھکر اٹھو اور اس تمام آلودگی سے اپنے دامن عزت کو صاف کر ڈالو ؎

دلا تا کے دریں کاخ مجازی — کنی مانند طفلاں خاک بازی
بیفشاں بال و پر ز آمیزش خاک — بپر تا کنگرۂ ایوان افلاک

دیکھو آزادی کے معنی ہم تمھیں تبلائیں ذرہ ٹھنڈے دماغ سے فرصت کے وقت اسے سوچنا۔

خلاف فطرت آزادی

انسان اگر اپنے اقوال و افعال میں اس طرح آزاد ہونا چاہے کہ جو منہ میں آئے کہے جائے اور جس طرح جو چاہے کئے جائے تو ایسی آزادی قطع نظر نفرت انگیز ہونے کے یقیناً محال و ممتنع الوجود ہے۔ اب لامحالہ کسی قواعد و اصول کا پابند ہو کر کچھ کہیگا یا کریگا اُس کے قول و فعل کا ایک دائرہ محدود ہوگا اور اُس کے وسعت کی ایک حد ہوگی اب ذرا اسے سوچو کہ محدود دائرہ میں جو کچھ کہ ایک انسان کہہ سکتا ہے یا کر سکتا ہے کیا اُس کے وہ قول و فعل آزاد ہیں۔ ایک غائر نظر اس کا

جواب تمہیں نفی میں دینگی اس لئے کہ صدور قول و فعل خیالات کے بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں پہلے ایک شئے دماغ میں آتی ہے پھر قوت متخیلہ اس پر غور کرتی ہے اس کے بعد ان خیالات کا اظہار اقوال افعال سے کیا جاتا ہے حکما کا قول ہے کہ اگر کسی کے خیالات کی بلندی و پستی مطالعہ کیا چاہو تو اس کے کلام و حرکات و سکنات پر متجسّسانہ نظر ڈالو اس لئے کہ اعمال و افعال صور خیالیہ کے آئینہ ہیں اس سے یہ امر تو واضح ہو گیا کہ قول و فعل آزاد نہیں بلکہ خیال کے پابند ہیں اب آؤ خیال کو دیکھیں اس کا کیا حال ہے ایک دقیق بین نگاہ اسکو بھی معلومات کا تربیت کا صحبت کا رسم و رواج کا مقتضیات ملک وغیرہ وغیرہ کا مقید پاتی ہے۔ جو خیال کہ انسان کے دماغ میں آتا ہے وہ نتیجہ ہے اس کی معلومات کا یا اس سوسائٹی کا جس میں اس نے نشو و نما پایا ہے۔ یا ملک کی رسم و رواج نے یہ خیال پیدا کر دیا ہے۔ یا گرد و پیش کے واقعات کا اثر ہے۔ غرض انھیں چیزوں سے خیال متاثر ہوتا رہتا ہے اور ان کے قیود سے نکل نہیں سکتا۔ الحاصل جب اقوال و افعال خیالات کے تابع ہوئے اور خیالات معلومات و تربیت و سوسائٹی وغیرہ کے قیدخانہ میں مقید رہے تو پھر آزادی کا نام ایک ایسا عنوان ہے جس کا معنون نہیں۔ ایسا لفظ ہے جس کا خارج میں وجود و معنی نہیں۔ اب سے ہمیں یہ فیصلہ ٹھہرانا ہے کہ خدا لگتی کہو کہ ہم اپنے خیالات کو تعلیمات و صحبت و طرز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیوں متبع نہ بنائیں۔ کیا مدینۃ العلم کی تعلیم کے سوا کوئی دوسری تعلیم حکومت کرنے کے لئے زائد سزاوار ہے؟ کیا انک لعلیٰ خلق عظیم کی تربیت سے کوئی تربیت زائد ہمیں حریت بخش ہے؟ ہرگز نہیں کبھی نہیں ؎

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد
کہ بستگان کمند تو رستگار انند

تعلیم نبوی کا معجزنما نتیجہ

یہ کوئی امر اعتقادی نہیں بلکہ واقعی ہے کہ تاجدار مدینہ نے محض اپنے دامن تربیت میں عرب جیسے جاہل و وحشی قوم کو لیکر چند دنوں میں کمالات کا مجسمہ بنا دیا اور دنیا کے لئے اپنی تعلیم و تربیت و صحبت کا ایک بے نظیر نمونہ چھوڑ گئے جو شخص عرب کے اس انقلاب کی طرف دیکھتا ہے سر دھنتا ہے۔ دماغ اس کا چکر میں آجاتا ہے اور یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ دم کے دم میں تاریکی روشنی سے جفا وفا سے قطع وصل سے فساد صلح سے عداوت محبت سے ذلت عزت سے خیانت امانت سے معصیت طاعت سے کدورت صفائی سے بدل کر دنیا کا رنگ ہی پلٹ دیا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ و اصحابہ و بارک وسلم یہی تھی وہ ہدایت جس کے لئے دنیا پیاسی تھی اسی آب حیات کا ذکر ہے اس آیہ کریمہ میں ھو الذی

ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله وکفیٰ باللہ شهیدا۔ اس قدر بیان جو توحید ورسالت وتعلیمات اسلامی کے متعلق ہوا۔ اس سے غرض یہ تھی کہ قرآن پاک کی عظمت برہان وحجت کے پہلو سے آپ حضرات کے سامنے پیش کروں تاکہ ارباب استدلال کو یہ معلوم ہوجائے کہ مذہب کا بازو اس حیثیت سے بھی بہت قوی ہے۔ اگر منصفانہ نگاہ سے کوئی قرآن کی تلاوت سمجھ کر کر جائے تو بیش بہا جواہرات کے خزائن اُسے ہر سورہ میں ملیں گے۔ میں نے تو صرف طالب ہدایت کے لئے ایک طریقہ بیان کردیا ہے۔

اب فقیر کی تقریر کا صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے جس کے پورا کرنیکے بعد میں اپنے ایفاے عہد سے سبکدوش ہوجاؤنگا۔ اور وہ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال میں ہوگا جس سے آپ کا خاتم النبین ہونا واضح واجلی ہوجائیگا۔ گو مسئلہ رسالت کی بحث میں بحث رسول بھی متضمن ہے لیکن اپنا دل یہی چاہتا ہے کہ اسے ایک مستقل عنوان قرار دوں۔

(محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

احتیاج نصب العین

انسان جس طرح ایک کامل وجامع دستور العمل کی طرف محتاج ہے اسی طرح اُسے اس کی بھی حاجت ہے کہ کوئی ذات اُس کی نگاہ کے سامنے ایسی ہو جس کی عملی زندگی اعلیٰ تشریح وتفصیل دستور خداوندی کی ہو۔ جس کی خلوت وجلوت کی باتیں جس کے حرکات وسکنات جس کا خور وخواب خدا کے فرمان کے بموجب ہو اور اُس کی ذات پر وہ تمام واقعات گذر گئے ہوں جن سے انسان کا دوچار ہونا لابد ہے۔ تاکہ اُس کی زندگی کے تمام شعبہاے حیات ہمارے لئے ایک عمدہ نمونہ بنکر رہبری کرنے والے ہوں اور ہم کسی امر میں کسی دوسرے کے محتاج نہوں۔

ایک جامع کمالات ذات

تواریخ عالم کے جاننے والوں سے یہ امر مخفی نہیں کہ دنیا میں کوئی ایسی ذات جو ہر طرح کے کمالات کی جامع ہو بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پائی نہیں جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف قرون میں مختلف باکمال اشخاص سے دنیا رونق گیر رہی ہے کسی میں شجاعت کا جوہر تھا اور کسی میں حلم وکرم کا وصف کوئی ان باکمالوں میں سلطان ذی جاہ تھا اور کوئی تمام تعلقات سے علحدہ ہوکر فانی فی اللہ باقی باللہ کا مجسمہ۔ لیکن وہ ذات جو تمام کمالات کا مجموعہ ہو وہ تو صرف اُسی تاجدار مدینہ کی ذات ہے۔ شریعت کی تعلیم اُسی اُمت نواز سے تھی۔ تزکیہ نفس اُسی روح پرور کے انفاس قدسیہ سے تھا۔ میدان جنگ میں وہ ایک بڑے سپہ سالار کی صورت میں دکھائی دیتا۔

انتظامات ملک میں ایک بڑا مدبر سلطان تھا۔ نزاعات باہمی و مناقشات کو فیصل کرنے میں ایک بے نظیر حاکم عادل تھا۔ پھر باوجود ان تمام کمالات کے صبر بردباری۔ عفو۔ تواضع۔ حیا۔ مروت۔ سخا۔ وقار۔ حفظ مراتب بلحاظ سب ان سب اوصاف کا علی وجہ الکمال ایک مرقع تھا۔ اُس رحمۃ للعالمین کا وجود صحابہ کرام کے لیے گوناگون کمالات کا ایک دار العلوم تھا جس کی زندگی کا ہر صفحہ ایک مبسوط رسالہ تھا اور صحابہ کرام اُس کے مطالعہ میں ہمہ تن مصروف تھے۔ تواریخ میں تم پڑھو گے کہ وہ لوگ جن کے دل کا لگاؤ حرب و ضرب سے ہوتا ہے۔ جب میدان کارزار میں اُترتے ہیں تو دشمن کے لئے بجز پرستش شمشیر و نوک سناں اُن کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے یہ سبق اپنے اصحاب کو پڑھایا کہ ایسے سخت ہیجان و جوش میں بھی وہ جذبہ مروت کو ضائع نہ کریں۔ ایک واقعہ سنو۔ جنگ بدر کے وقت کفار کی جماعت میں ایک کافر ابو البختری بھی آتا ہے۔ بمقابلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اُس وقت جبکہ آپ مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے اور کفار طرح طرح کی اذیتیں آپ کو دیتے اور اشاعت اسلام میں گوناگوں رکاوٹیں پیدا کرتے تھے) ابو البختری نے سکوت سے کام لیا تھا اُس کی صرف اس قدر رعایت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو از حد خیال تھا۔ کہ اُس حال میں جبکہ کفار کے ساتھ وہ بھی لڑنے کو آیا ہوا تھا۔ آپ نے اصحاب کو یہ ہدایت فرمائی کہ اگر ابو البختری کا مقابلہ ہو جائے تو اُسے قتل نہ کرنا بلکہ زندہ میرے پاس امان دیکر لے آنا اس لئے کہ وہ قیام مکہ کے وقت میرے آزار کا موجب نہ ہوا تھا۔ یہ ایک بیش بہا مروت کی مثال آپ نے جنگ کے وقت دشمن کے مقابلہ میں قائم فرمائی۔ دوسرا واقعہ سنو۔ جنگ بدر میں جبکہ کفار کو شکست ہوئی اور ستر قیدی اسیر لائے گئے تو اُن میں ایک حضرت عباس عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ قیدیوں کی مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ آنحضرت کا خیمہ قیدیوں سے قریب تھا۔ حضرت عباس بندش کی سختی سے کراہتے۔ رحمۃ للعالمین کا دل مضطر ہو گیا۔ حکم فرمایا کہ عباس کے بند کھول دیے جائیں اس کے ساتھ ہی حکم ہوا کہ جتنے قیدی ہیں سب کے ہاتھ کھول دو۔ کسی کی مشک بندھی نہ رہے۔ یہ دوسرا سبق رحمت و شفقت کا ہے فاتح قوم کو یہ درس دیا گیا کہ مفتوح اشخاص کو اپنے فاتحانہ جوش کا مشق نہ بناؤ۔ مہربانی و شفقت کو دشمن سے بھی دریغ نہ رکھو۔

تامل صادق سے کام لو تو ہر خصلت و عادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھیں ایک معجزہ معلوم ہوگی۔ رتبہ ایسا جلیل الشان کہ خاتم النبیین اللہ تعالیٰ نے فرمادیا۔ آپ کے بعد دوسرا نبی یا رسول ہونا محال و ممتنع بالذات۔ رسالت ایسی عامہ و تامہ کہ تمام دنیا کا رسول بنا کر اللہ نے بھیجا لیکن اس پر تواضع و انکساری

کا یہ عالم کہ شکستہ حالوں میں مل کر بیٹھ جاتے اور فرماتے مسکین جالس عند المساکین (ایک مسکین ہے جو مسکینوں میں بیٹھا ہوا ہے) تہذیب ایسی ارفع و اعلیٰ کہ تمام عمر نہ کوئی فحش کلمہ زبان پر آیا نہ کسی کو کبھی گالی دی کسی ذاتی امر کے لئے نہ تو کبھی غصہ فرمایا نہ کسی کام کا اپنی ذات کے لئے حکم فرمایا۔ ان امور کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جبکہ اُس کے بلندی رتبہ کو ذرا لحاظ کرو۔ اللہ تعالیٰ یوں حکم دیتا ہے۔ لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجہروا لہ بالقول کجہر بعضکم بعضا (یعنی نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو اور نہ اُسے اس طرح پکارو جیسا کہ آپس میں ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہو) صحابہ کی حالت یہ کہ دربار رسالت میں اس طرح مودب بیٹھتے تھے کہ جسم میں حرکت تک نہیں ہوتی تھی گویا کہ اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ مگر اس پیغمبر کی ذرہ نوازی و وسعت اخلاق یہ کہ ہر ایک کی دل دہی و دل جوئی ہو رہی ہے ایک مرتبہ دربار رسالت آراستہ ہے۔ مجلس میں اس کثرت سے صحابہ حاضر ہیں کہ کہیں جنبش تک کی جگہ باقی نہیں ایسے وقت میں ایک اعرابی آتا ہے اِدھر اُدھر دیکھ کر صف نعال میں بیٹھ جاتا ہے حضور سے جو اس قدر دور جگہ پائی تو اس سے شکستہ خاطر ہوتا ہے فوراً اخلاق محمدی بڑھکر اس شکستہ دل کی خبر لیتا ہے آنحضرت نے اپنی ردائے مبارک اُس کی طرف پھینکی اور فرمایا اے شخص تو اس کو بچھا کر وہاں بیٹھ جا۔ اب دیکھ لو اگر ایک شخص دولت قرب سے مالا مال ہے تو صف نعال کا بیٹھنے والا بھی اپنا دماغ اُس کے ہم پلہ پاتا ہے کہ میرے پاس وہ چادر ہے جو جسم اطہر سے لپٹی رہتی ہے۔

اس قوت و رعب کے ساتھ عدل کا ایسا خیال کہ جنگ بدر کے موقع پر آپ اصحاب کی صفیں مرتب و مسلسل فرما رہے ہیں۔ سواد بن غزیہ ذرا صف سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک تیر بغیر پیکان کے ہے جس سے آپ صفوں کو سیدھا فرما رہے تھے۔ سواد کو صف سے نکلا ہوا دیکھ کر آپ نے تیر کی لکڑی سے ایک کوچہ اُن کے پیٹ میں دیکر فرمایا کہ صف میں داخل ہو۔ حضرت سواد صف میں داخل ہو گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی اس کا عوض دیجئے معاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کرتہ شکم مبارک سے اٹھا لیا اور فرمایا کہ عوض لے لو حضرت سواد نے شکم مبارک کو بوسہ دیا اور لپٹ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہے۔ سواد عرض کرتے ہیں کہ آج کا معرکہ سخت ہے تھوڑی دیر میں دشمن سے دست و گریبان ہونگے ہو سکتا ہے کہ یہ وقت میری زندگی کی آخری ساعت ہو۔ اس لئے میری تمنا تھی کہ میرا بدن آپ کے جسم مقدس سے اس طرح ایک دفعہ مل جائے کہ کوئی کپڑا وغیرہ بیچ میں حائل نہ ہو۔

Date — 24/10/2003

J. Ahmad. Research Scholar. of Arabic

یہی آخری توشہ اس عالم سے میرا ہوگا۔ آپ نے یہ سنکر انھیں دعائے خیر فرمائی ے زجرمے کز کمال عشق خیزد + کجا معشوق با عاشق ستیزد۔ اس کشادہ دلی وعدل کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ اقوام عاجز ہے۔ اپنی عملی زندگی سے اس طرح اخلاق شفقت۔ رحم، مروت عدل کا سبق دنیا کو کس نے دیا یہ مضمون جس قدر کہ وسیع ہے اسی قدر دلکش بھی ہے مگر افسوس ہے کہ فقیر حسب دلخواہ بیان کرنے سے قاصر ہے۔ آپ حضرات بھی اس وقت معاف فرمائیں۔ کیا کہا جائے ے ولم خزینۂ اسرار بود دست قضا + درش ببست وکلیدش بدلستانی داد۔

غایت کمال انسانی

اب صرف ایک واقعہ مختصراً چند جملوں میں گزارش کرونگا جس سے طرح طرح کے کمالات محمدی آپ کو معلوم ہونگے اور وہ واقعہ فتح مکہ کا ہے۔ مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ داخل ہوتے ہیں یہ وہی جگہ ہے جہاں لوگوں نے اپنی اذیت رسانی سے چین کی سانس لینی دشوار کردی تھی۔ بالآخر خدا کے بیت معظم سے اللہ کے رسول کو جدائی اختیار کرنی پڑی۔ قوم نے اس وقت نہ تو قرابت کا لحاظ کیا تھا نہ شرافت خاندانی نظر میں لائی تھی نہ آپ کے اخلاق کریمانہ کا کچھ پاس کیا تھا۔ جب آپ ہجرت فرماکر مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہوئے تو وہاں بھی اطمینان سے رہنے نہ دیا۔ برابر مدینہ پر چڑھ چڑھ کر گئے اور متعدد بار اللہ کے حبیب سے مقابل ہوئے۔ غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ خندق وغیرہ وغیرہ اس کے شاہد ہیں۔ رسول اللہ صلعم اپنے خالق کی عبادت ادا کرنے کی غرض سے تشریف لاتے ہیں۔ وعدہ فرماتے ہیں کہ صرف عمرہ ادا کرلینے دو فوراً مدینہ کو واپس چلا جاؤنگا۔ کسی امر سے یا کسی شخص سے کسی طرح کا تعرض نہ کرونگا، مگر اہل مکہ نہیں مانتے ہیں۔ آج اللہ تعالی فتح عطا فرماتا ہے۔ شیاطین کے تخت اوندھے جاتے ہیں توحید کے سر پر تاج آرائی ہوتی ہے۔ اللہ تعالی کا حبیب دس ہزار مجاہدین کی جمعیت سے داخل مکہ معظمہ ہوتا ہے۔ مجاہدین اس شان سے داخل ہوتے جاتے ہیں کہ ہر قبیلہ اپنا علم ہاتھ میں لئے ہوئے اپنے سردار کے ساتھ ہے۔ ایک ایک قبیلہ ترتیب سے گزرتا جاتا ہے۔ تکبیر وتہلیل کے دل کپکپا دینے والے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ سب کے بعد تاج الانبیا فخر الرسل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی جماعت کے ساتھ گزرتے ہیں جن میں مہاجرین وانصار ہیں۔ بیچ میں آنحضرت کا ناقہ ہے اور اس کے گرداگرد جاں بازوں کا حلقہ۔ سب کا لباس سبز ہے تمام وکمال اسلحہ جنگ میں مرصع ہیں خود وزرہ نے تمام بدن چھپا رکھا ہے بجز آنکھوں کی پتلی کے اور کوئی حصہ جسم محمدی کے جاں نثاروں کا دکھلائی نہیں دیتا۔ اس شان حق کو دیکھکر عرب کے بہادروں کے دل دہل گئے۔ کلیجہ کانپنے لگا۔ جب آنحضرت مقام ذی طوی پر تشریف لائے تو کچھ توقف کیا۔ عہد سابق یاد آجاتا ہے۔ کفار کے مظالم کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

اب بجائے اس کے کہ جوشِ انتقام دل میں اُٹھتا یا علو و افتخار نفس میں پیدا ہوتا نہایت تذلل و انکسار سے ناقہ کے کجاوہ پر چادر کا کونہ ڈالکر سر بسجود ہو جاتے ہیں۔ خدا کی جناب میں جبہ سائی ہے اور اُس کے فضل و کرم پر شکر گزاری۔ سعد بن عبادہ کے منہ سے جوش میں یہ کلمہ نکل جاتا ہے کہ آج کعبہ کی تاخت و تاراج حلال ہوگی فوراً اُنھیں اس کہنے سے روکا جاتا ہے اور اُن سے جھنڈا لیکر انھیں تو لشکر میں داخل اور جھنڈا حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ کے حوالہ فرمایا جاتا ہے۔

عجز و انکسار اس فتح و قوت پر تو دیکھ چکے اب ذرا اس مقام کو دیکھو نقیب و منادی ہر طرف پھیل گئے ہیں۔ پکارتے جاتے ہیں کہ جو مسجد حرم میں داخل ہو جائے اُسے امان ہے جو سفیان کے گھر میں چلا جائے اُسے امان ہے جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے اُسے امان ہے جو ام ہانی کے مکان میں داخل ہو اُسے امان ہے۔ جو ہتھیار ڈال دے اُسے امان ہے۔ غرض ایک امان کی صدا تھی جو در و دیوار سے گونج رہی تھی۔ اس رحمت و کرم کو دیکھ کر کفار مشرکین کا دل بھی اُمنڈ آیا۔ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا پر رونق افروز ہو کر بیعت اسلام لیتے اور ہدایت کی جامع نصیحت فرماتے۔

اسی حالت میں ہند زوجہ ابوسفیان جس کے کفر و غیظ کی شدت اس سے ظاہر ہے کہ حضرت حمزہ عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کچا کلیجہ اُس نے چبایا تھا حاضر خدمت اقدس ہوتی ہے مسلمانوں کے خوف سے تمام جسم چادر میں لپیٹ لیا تھا کہ مبادا کوئی پہچان کر حضرت حمزہ کی بیحرمتی کے عوض کہیں قتل نہ کر ڈالے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم پر اُس قدر اطمینان تھا کہ جب سامنے پہونچی تو نقاب رخ سے اُٹھا دیا اور عرض کیا کہ میں ہندہ زوجہ ابوسفیان ہوں۔ آپ کو اپنے چچا کی حالت یاد آگئی۔ اُس کی جانب سے منہ موڑ لیا۔ اُس نے فوراً اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمدا عبدہ و رسولہ باواز بلند پڑھا۔ کلمہ طیبہ کا اُس کی زبان سے نکلنا تھا کہ سارا ملال دل سے جاتا رہا۔ یہ ہے جوش انتقام۔ صاحبو! ان واقعات کو قصہ کی طرح نہ سنئے۔ سوچئے غور کیجئے کہ کیا فاتحانہ جوش اسی کا مقتضی تھا کہ اماں اماں کی صدا پکار دی جائے۔ لوگوں کے مکانات و متاع و آبرو سے کچھ تعرض نہ کیا جائے۔ انتہا یہ کہ اگر جوش میں بھی کوئی جملہ منہ سے کسی کے نکل جائے تو اس سے آزردہ ہوں۔ ایک ایسی قوم پر جس نے مدتوں مشقِ ستم مسلمانوں کو بنائے رکھا ہو یہ الطاف و کرم کئے جائیں نہ فتح سے نفس متلذذ ہوتا ہے نہ اس شوکت و غلبہ پر کچھ فخر کرتا ہے۔ وہی نیاز و سجود ہے اور وہی عبادت نہ دعوت کے جلسے ہیں نہ جشن کی مجلسیں نماز کا وقت ہوتا ہے حضرت بلال اذان دیتے ہیں اور

اللہ کا محبوب اپنی امت کو لیکر مسجد حرام میں آٹھ برس بعد آج اپنے خالق کی نماز ادا کرتا ہے یہ وہ باتیں ہیں کہ سننے میں حسین تر ہیں آئندہ بھی عمل ہی اسی قدر معرکۃ الآرا ہیں کوئی دوسری مثال تم کسی قوم کی پیش نہ کر سکو گے سلطنت اور شے ہے اور نبوت و رسالت کچھ اور۔ یہ تجلیات ختم رسالت کی تھیں اس کا مقابلہ ملمع کاری و قلعی سازی کیا کریگی ؎

دہان یار کجا و زبان سوسن کو
نہ ہر گلے کہ بخند د مقرری داند

دور کیوں جائیے حالت موجودہ کو لے لیجئے۔ اس وقت یورپ نے تہذیب کا وہ غلغلہ بلند کیا تھا کہ کتنی مسلمانوں کی اولاد اُن کے اس ہنگامے میں ایسی تہ و بالا ہوئی کہ اسلامی معاشرت اسلامی لباس اسلامی صورت یہاں تک کہ اسلامی نام سے آپسے چڑ ہو گئی۔ خواب میں بھی یورپ کا جلوہ ہے اور بیداری میں بھی اسی کا تصور۔ اب جو یورپ کے حصص باہم لڑ پڑے تو تہذیب و تمدن کا جامہ اُن کے جسم سے الگ ہو گیا اور اُنکی وحشت اور بربریت صاف صاف ہر شخص کو نظر آنے لگی۔ جرمنی جس نے تہذیب و انکشافات علمیہ میں تمام یورپ سے اپنی استادی کا سکہ منوالیا تھا جب میدان جنگ میں اترتا ہے تو بلجیم کے ساتھ صرف اتنی بات کہ اس نے راستہ دینے سے انکار کیا تھا اور اپنی خود مختاری و حقوق کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا کیسا عبرتناک سلوک کیا۔ پھر جب استاد کی یہ حالت ہو تو شاگردوں کا کیا پوچھنا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

حیات محمدی کا ایک دوسرا پہلو

اب ایک نظر اپنے پیغمبر کے اس پر انوار حصہ زندگی پر ڈالیے جس کا تعلق محض خالق سے تھا۔ باوجود ان گوناگون مہمات اور مختلف خدمت و اصلاح عباد کے عبادت الٰہی میں وہ کس طرح مستغرق ہے۔ امت کی تعلیم و تربیت۔ کفار و مشرکین یہود و نصاریٰ کی مدافعت۔ اہل و عیال کی کفالت۔ غرض طرح بطرح کے اہم امور روزانہ درپیش ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ پر باحسن وجوہ انجام پا رہے ہیں مگر کیا مجال کہ ان مصروفیتوں میں اوجھ کر صلوۃ و صیام میں کچھ گرانی بھی ہونے پائے۔ حضرت عائشہ صدیقہ آپ کی نماز تہجد کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتی ہیں کہ فلا تسئل عن طولہن وحسنہن (یہ نہ پوچھو کہ وہ کس قدر دراز اور کس قدر خوبصورت نمازیں ہوتی تھیں) تمام رات قیام میں بسر فرماتے اور ایک حالت ذوق و شوق میں کلام اللہ پڑھتے چلے جاتے رات ختم ہو جاتی اور عبادت کی تمنا باقی ہی رہ جاتی۔ یہاں تک کہ قدم مبارک ورم کر گئے۔ اس واقعہ کی خبر قرآن کریم

یوں دیتا ہے طٰہٰ ما انزلنا علیک القراٰن لتشقیٰ الا تذکرۃ لمن یخشیٰ (اے حبیب قراٰن ہم نے اس لئے نہیں نازل کیا کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ یہ تو ڈرنیوالوں کے لئے ایک نصیحت ہی)۔

حضرات! اس پر لطف مضمون کو کہاں تک بیان کروں ؎ نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں۔ صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہوگا کہ عبادت ہی آنحضرت کی چین تھی اور یہی آپ کا آرام تھا۔ اس کے سوا کسی چیز میں آپ کو لذت نہیں ملتی تھی جب کبھی طبع لطیف حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکدر ہوتی تو حضرت بلال سے فرماتے کہ ارحنی یا بلال (اے بلال مجھے راحت پہونچاؤ) حضرت بلال اذان دیتے۔ اس کبیر المتعال کا نام ترتیب اذان میں سُنکر اس پیکر عشق الٰہی کو عجب فرحت و انبساط ہوتا ہے ؎

دل زندہ می شود بامید وصال یار + جاں رقص می کند بسماع کلام دوست

دل میں ایک طرب انگیز حقیقی سرور پیدا ہوتا اور سر تن مو بادۂ محبت الٰہی میں مخمور ہوجاتی۔ شوق لیجا کر محراب عبادت میں کھڑا کر دیتا اور وہ خدا کا محب و محبوب نماز میں مصروف ہوکر عالم ناسوت و ملکوت طے کرتا ہوا لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل پر پہنچکر مشاہدۂ تجلیات شاہد حقیقی میں مصروف ہوجاتا اور فارغ ہوکر اپنی اُمت سے فرماتا کہ قرۃ عینی فی الصلوٰۃ میرے آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

ختم کلام

اے حضرات۔ غور کرو۔ یہ بے سروپا زندگی کب تک۔ ہفوات و لایعنی کلمات کا ورد کہاں تک۔ عمر گران بہا کا صرف کس حد تک آؤ ہم اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار دیں تاکہ ہمارے اقوال و افعال ایک محور پر گردش کریں۔ جب تک اقوال و افعال کا کوئی محور قرار نہ دینگے اس وقت تک ہماری زندگیاں صحیح نتیجے پر نہ پہونچینگے۔

زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے اس سے لیل و نہار و تغیرات موسم پیدا ہوکر طرح طرح کے گل کھلاتے ہیں اور کیسے عجیب و غریب فوائد ہیں اس سے حاصل ہوتے ہیں۔ پس ہمارے اقوال و افعال اگر ایک محور پر گردش کرینگے تو کیا ان سے مفید نتائج حاصل نہونگے؟ ہونگے اور ضرور ہونگے۔ پس

اب ہمیں ایک محور تلاش کرنا ہے۔ مگر اس کی تلاش میں ہمارا زیادہ وقت رائگاں نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہم کو جب یہ معلوم ہو جائیگا کہ ہمارے پیغمبر روحی فداہ نے کونسا محور اپنی حیات کا قرار دیا تھا تو ہم نہایت سہولت سے اس میں کامیاب ہو جائینگے۔ آؤ قرآن شریف ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک کا یہ محور بتلاتا ہے۔

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین کہدو اے میرے محبوب کہ میری نمازوں کا پڑھنا عبادتوں کا کرنا یہاں تک کہ جینا اور مرنا سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو تمام عالم کا رب ہے ؎

عاشقی دانی چہ باشد بے دل و جاں زیستن + جان و دل در باختن بر بوئے جاناں زیستن۔

پس معلوم ہوا کہ اگر ہمارے تمام اقوال و افعال اس محور کے گرد چکر لگائیں تو زبان بھی آفات سے محفوظ اور جوارح بھی معاصی سے امن میں رہ سکتے ہیں۔ خدا کو حاضر و ناظر جانو۔ پھر جو چاہو کہو اور جو چاہو کرو اور جہاں چاہو جاؤ۔ یہ وہ خیال ہے اور اس کا ایسا تصرف ہے کہ تمھیں لغو و بیہودہ اقوال و افعال سے اُس حال میں بھی باز رکھیگا جس حالت میں کسی قانون بشری کی نگاہ یا اُس کا پنجہ گرفت تم تک نہیں پہونچ سکتا ہوگا۔ زبردست سے زبردست قانون زبان و اعضا کو ارتکاب جرائم سے البتہ باز رکھتے ہیں اور ان پر حکومت کر سکتے ہیں۔ لیکن دلوں پر حکومت کرنے والا اور معاصی کی بنیاد قلب سے زائل کرنے والا تو صرف خداہی کا خوف اور اُسی کی یاد اور اُسی کا نام ہے۔ پس اے دوستو۔ صدق و اخلاق سے للّٰہیت کو اپنی زندگی کا محور قرار دو اور بے کھٹکے نہایت کامیاب شاداں و فرحاں اس دارالمحن سے سفر کر جاؤ۔ اب اس سے زیادہ کیا کہوں ؎

گفتگو آئین درویشی نہ بود
ورنہ با تو ماجراہا داشتم

آہ اے گلشن اسلام کیا ہوئی تیری وہ بہار جس نے اپنے فیض کرم سے خار زار جفا کو لالہ زار وفا بنا دیا تھا؛ سوکھی کلیاں لبہائے جاناں کی طرح تر و تازہ پنکھڑیاں نکال لائی تھیں، ہر شاخ نخل اثمار خوشگوار سے باردار تھی، اور ہر برگ ایک ایک رگ میں لاکھوں چشمے سرسبزی کی امانت رکھتی تھی، تیری باد سموم یورپ کی نسیم سحر سے کہیں بڑھ چڑھ کر خدمت صبا انجام دیتی تھی، اس کا ایک جھونکا غنچہائے سربستہ کو کھلا دیتا تھا۔ اب وہی تو ہے وہی تیرے مرغان طرب کی صدائیں ولیکن نہ کوئی کان اُن کو سننا گوارا کرتا ہے نہ کوئی دماغ اُن سے راحت پاتا ہے عقل کو حیرت ہے اور ذہن کو چکر کہ آخر دیکھتے دیکھتے یہ رنگ چمن کیونکر بدلا؛ باغبانی کی خدمت جن کے قبضہ قدرت میں دی گئی تھی وہ کیوں بے سرے

سڈول و بیڈول کوئی شاخ نہیں دیکھتے چپاٹنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ قرآنی تعلیموں کی نہریں اسی طرح جاری مگر سیراب طلب العطش العطش کی رٹ لگائیں۔ احادیث کریمہ کے حوض اسی طرح لبریز لیکن اوراق الٹنے والے ایک قطرہ بھی نہ پائیں۔ فقہ کے مسائل اسی طرح حاجت روا لیکن قوانین مجریہ کے ہاتھوں اعتنا شکنی کے شکار۔ تصوف کے نکات طالب راہ کے واسطے اسی طرح مشعل بکف مگر علوم جدیدہ کی جھوٹی چمک کی بدولت اندھیر کا ڈھیر۔ علم کلام حل مشکلات فلسفہ میں مخزن حکمت مگر عقول حل و عقد سے دفتر پارینہ مسائل کہن تیرے رفیق نہیں، امرا تیرے غمگسار نہیں۔ نہ بوریہ میں تیرا جلوہ، نہ مسند میں تو رونق بخش۔ افسوس! اے

اے صبا مایہ سودا نہ تو داری و نہ من

بوئے آں زلف چلیپا نہ تو داری و نہ من

اللهم افتح لنا بالخير واختم لنا بالخير واجعل عواقب امورنا بالخير بيدك الخير انك على كل شئ قدير وصلى الله تعالى على من هو الاول والآخر والظاهر والباطن وهو بكل شئ عليم

حررہ بقلمہ

فقیر محمد سلیمان اشرف عفی عنہ

قصبہ بہار۔ محلہ میر داد

۱۳۷۶۳